صدر جنرل پرویز مشرف مغالطے میں نہ رہیں!
پاکستان کا استحکام ہی نہیں، محض بقا بھی

قیامِ نظامِ خلافت پر منحصر ہے!

بلکہ اصولی اور دستوری اعتبار سے پاکستان میں نظام خلافت ۱۲/مارچ ۱۹۴۹ء کو **قراردادِ مقاصد** کی صورت میں نافذ ہو چکا ہے، اب صرف اس کی تعمیل و تکمیل باقی ہے!

—— واضح رہے کہ خلافت سے مراد ——

اللہ تعالیٰ کو حاکم مطلق تسلیم کرتے ہوئے حکومت کو ایک مقدس امانت کے طور پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات و تعلیمات کے مطابق چلانا ہے!

- نظام خلافت ہی ہر سطح پر عدل وانصاف اور حقوق انسانی کے تحفظ کا ضامن ہے۔
- شورائیت کی بنیاد پر چلنے والا یہ نظام ہی اعلیٰ ترین جمہوری روایات کا امین ہے۔
- نظام خلافت ہی نے دنیا کو کفالتِ عامہ کے تصور سے روشناس کرایا جو ہر شہری کی بنیادی ضروریات فراہم کرنے کا ذمہ دار ہے۔
- اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نظام خلافت کے قیام سے ہی اللہ کی مدد اور رحمت ہمیں حاصل ہو سکے گی جس کے بغیر ہم امریکہ کے ہاتھوں میں کھلونا بنے ہوئے ہیں۔

منجانب: **تنظیم اسلامی پاکستان**
67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور (فون: 6316638,6366638)

(یہ اشتہار 17 ستمبر کو روزنامہ جنگ اور نوائے وقت میں شائع کرایا گیا)

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

جلد: ۵۲
شمارہ: ۱۰
شعبان المعظم ۱۴۲۴ھ
اکتوبر ۲۰۰۳ء
فی شمارہ ۱۲/-

ادارۂ تحریر
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

☆ اندرون ملک	125 روپے
☆ ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ	800 روپے
☆ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ	1000 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: 36-کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700، فون: 03-02-5869501
فیکس: 5834000 ای میل: anjuman@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67-گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور
فون: 6316638-6366638 فیکس: 6305110
ای میل: markaz@tanzeem.org

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرض احوال ـــــــــــــــــــــــــــــــــ ۳

حافظ عاکف سعید

منتخب نصاب۔۲ ـــــــــــــــــــــــــــــــــ ۵

اقامت دین کی جدوجہد کرنے والی
جماعت کی ہیئت ترکیبی اور تنظیمی اساس

ڈاکٹر اسرار احمد

منہاج المسلم (۳۳) ـــــــــــــــــــــــــــــــــ ۳۹

- توکل اور خود اعتمادی
- ایثار

علامہ ابوبکر جابر الجزائری

شفاء لما فی الصدور ـــــــــــــــــــــــــــــــــ ۵۱

دِل مُردہ دل نہیں ہے......

علامہ ابن قیم الجوزیہؒ

اسلامی معاشرت ـــــــــــــــــــــــــــــــــ ۵۳

قرض کا لین دین اور اسلامی تعلیمات

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

دنیائے اسلام ـــــــــــــــــــــــــــــــــ ۶۱

افغانستان

سید قاسم محمود

❁ ❁ ❁

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض احوال

پاکستان ایک بار پھر ''فرقہ وارانہ دہشت گردی'' کی لپیٹ میں ہے۔ چند ماہ قبل کوئٹہ میں دہشت گردی کی ایک بہیمانہ کارروائی میں متعدد اہل تشیع لقمۂ اجل بنے' پچھلے دنوں کراچی میں سپاہ کو کی وین پر گولیاں برسا کر جن بے گناہوں کو بھونا گیا' وہ بھی مسلکاً شیعہ برادری سے تعلق رکھتے تھے اور اب چند روز قبل سپاہِ صحابہ کے قائد و رہنما مولانا اعظم طارق کا اپنے مسلح محافظوں سمیت سفاکانہ قتل بظاہر ایک ہی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتے ہیں اور بادی النظر میں مذہبی فرقہ وارانہ کشیدگی کا شاخسانہ نظر آتے ہیں ـــــ لیکن ہماری رائے میں' جس کا اظہار اس سے پہلے بھی مختلف مواقع پر ہماری جانب سے ہوتا رہا ہے' یہ سب پاکستان کو دہشت گردی کا اڈہ اور مذہبی منافرت کا گہوارا قرار دینے کی اس عالمی سازش کا حصہ ہیں جس کے لئے اسلام دشمن عالمی خفیہ ایجنسیاں ایک عرصے سے سرگرم عمل ہیں۔ را' موساد اور سی آئی اے جس منظم انداز میں پاکستان کو عدم استحکام سے دوچار رکھنے کے لئے فرقہ وارانہ کشیدگی کی آڑ میں اپنا گھناؤنا کھیل کھیل رہی ہیں' اس سے کوئی ذی شعور انسان انکار نہیں کر سکتا۔ حالیہ دہشت گردی کے واقعات میں منصوبہ بندی اور پیشہ ورانہ مہارت کا جو غیر معمولی مظاہرہ ہوا ہے وہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ان واقعات کے پیچھے عالمی خفیہ ایجنسیوں کی کارفرمائی ہے۔ اس تناظر میں آئی جی اسلام آباد کا یہ کہنا کہ ''یہ دہشت گردی کی نہیں بلکہ فرقہ وارانہ واردات ہے'' تجاہلِ عارفانہ کی ایک اچھوتی مثال نہیں تو اور کیا ہے!

بدقسمتی سے ہماری سابقہ نام نہاد جمہوری حکومتوں سمیت موجودہ حکومت کی بھی یہ کمزوری رہی ہے کہ وہ دہشت گردی کے واقعات کے پس پردہ اصل مجرموں اور خفیہ ایجنسیوں کا پتہ چلانے اور ملک دشمن عناصر کی جڑوں تک پہنچ کر اُن کے مذموم منصوبوں کا سدباب کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ یا اگر انہیں اس معاملے میں کبھی کوئی کامیابی ملی

بھی ہے تو نامعلوم مصلحتوں کے پیش نظر تحقیق و تفتیش کے نتائج کو منظر عام پر لانے سے شاید اس لئے گریز کیا گیا ہے کہ اس میں کچھ پردہ نشینوں کے نام سامنے آنے کا اندیشہ بھی تھا—— سبب کچھ بھی ہو، حکومت کی اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہے کہ دہشت گرد طبقات کی حوصلہ افزائی ہوئی اور انہیں کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ ہمارے نزدیک مولانا اعظم طارق کی شہادت سمیت دہشت گردی کے ان تمام حالیہ واقعات کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے جو اِن ملک دشمن سرگرمیوں کا سدباب کرنے میں بری طرح ناکام رہی ہے۔ جو حکومت لاء اینڈ آرڈر کو کنٹرول نہ کر سکے، مجرموں کا سراغ لگانے اور انہیں کیفر کردار تک پہنچانے کی اہلیت نہ رکھتی ہو وہ حکومت کرنے کے اخلاقی جواز سے یکسر محروم ہے۔ مولانا اعظم طارق ایک نامور عالم دین ہی نہیں، معزز رکن پارلیمنٹ بھی تھے۔ ان پر متعدد قاتلانہ حملے ماضی میں ہو چکے تھے۔ ایسے شخص کی جان کا تحفظ نہ کر سکنا موجودہ حکومت کی نااہلی کا بہت بڑا ثبوت ہے۔

طرفہ تماشا ہے کہ داخلی طور پر امن و امان کے قیام میں ناکام حکومت نمبر ون عالمی دہشت گرد امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف عالمی مہم میں، جو دراصل اسلام کو کچلنے کی عالمی مہم ہے، امریکہ کے حلیف اور معاون کا رول ادا کر رہی ہے۔ ہمارے سربراہانِ حکومت، خواہ وہ پرویز مشرف ہوں یا جمالی صاحب، جب امریکہ کا دورہ کرتے ہیں تو فرعونِ وقت کی بارگاہ میں حاضری کے موقع پر کچھ نذر نیاز پیش کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ وہ بچے کھچے مسلمان مجاہدین جو افغانستان میں روس جیسی سفاک عالمی قوت کے خلاف پیکار رہے اور اب وہ ہمارے قبائلی علاقوں میں پناہ گزین ہیں اور نام نہاد مسلمان ممالک سے اپنی جان بچانے کے لئے روپوش ہیں، ایسے موقع پر قربانی کا بکرا بنتے ہیں اور انہیں ''آستانۂ امریکہ'' پر قربان کر کے فرعونِ وقت کی خوشنودی حاصل کی جاتی ہے۔ کیا پاکستان اس لئے بنایا گیا تھا؟—— کیا یہ شرمناک کردار پاکستان کا مقدر بننا تھا——!! حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے!

بھی ہے تو نامعلوم مصلحتوں کے پیش نظر تحقیق و تفتیش کے نتائج کو منظر عام پر لانے سے شاید اس لئے گریز کیا گیا ہے کہ اس میں کچھ پردہ نشینوں کے نام سامنے آنے کا اندیشہ بھی تھا—— سبب کچھ بھی ہو' حکومت کی اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہے کہ دہشت گرد طبقات کی حوصلہ افزائی ہوئی اور انہیں کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ ہمارے نزدیک مولانا اعظم طارق کی شہادت سمیت دہشت گردی کے ان تمام حالیہ واقعات کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے جو اِن ملک دشمن سرگرمیوں کا سدباب کرنے میں بری طرح ناکام رہی ہے۔ جو حکومت لاء اینڈ آرڈر کو کنٹرول نہ کر سکے' مجرموں کا سراغ لگانے اور انہیں کیفر کردار تک پہنچانے کی اہلیت نہ رکھتی ہو وہ حکومت کرنے کے اخلاقی جواز سے یکسر محروم ہے۔ مولانا اعظم طارق ایک نامور عالم دین ہی نہیں' معزز رکن پارلیمنٹ بھی تھے۔ ان پر متعدد قاتلانہ حملے ماضی میں ہو چکے تھے۔ ایسے شخص کی جان کا تحفظ نہ کر سکنا موجودہ حکومت کی نااہلی کا بہت بڑا ثبوت ہے۔

طرفہ تماشا ہے کہ داخلی طور پر امن و امان کے قیام میں ناکام حکومت نمبرون عالمی دہشت گرد امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف عالمی مہم میں' جو دراصل اسلام کو کچلنے کی عالمی مہم ہے' امریکہ کے حلیف اور معاون کا رول ادا کر رہی ہے۔ ہمارے سربراہانِ حکومت' خواہ وہ پرویز مشرف ہوں یا جمالی صاحب' جب امریکہ کا دورہ کرتے ہیں تو فرعونِ وقت کی بارگاہ میں حاضری کے موقع پر کچھ نذر نیاز پیش کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ وہ بچے کھچے مسلمان مجاہدین جو افغانستان میں روس جیسی سفاک عالمی قوت کے خلاف پیکار رہے اور اب وہ ہمارے قبائلی علاقوں میں پناہ گزین ہیں اور نام نہاد مسلمان ممالک سے اپنی جان بچانے کے لئے روپوش ہیں' ایسے موقع پر قربانی کا بکرا بنتے ہیں اور انہیں ''آستانۂ امریکہ'' پر قربان کر کے فرعونِ وقت کی خوشنودی حاصل کی جاتی ہے۔ کیا پاکستان اس لئے بنایا گیا تھا؟—— کیا یہ شرمناک کردار پاکستان کا مقدر بننا تھا——!! حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے!

(اقامت دین کی جدوجہد کرنے والی جماعت کے اوصاف اور تنظیمی مسائل کے ضمن میں ہدایات)

درس ۵

اقامتِ دین کی جدّوجُہد کرنے والی جماعت کی ہیئتِ ترکیبی اور تنظیمی اساس

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہ الکریم ..... امّا بعدُ:

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ..... بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰہِ کَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَۃٌ مِّنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَکَفَرَتْ طَّآئِفَۃٌ ۚ فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰی عَدُوِّھِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰھِرِیْنَ۝﴾ (الصف: ۱۴)

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ..... الآیۃ﴾ (الفتح: ۲۹)

﴿اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ؕ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ ۣ وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىۃِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِہٖ ؕ وَذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ۝﴾ (التوبۃ: ۱۱۱)

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ ؕ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ ۚ فَمَنْ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنْکُثُ عَلٰی نَفْسِہٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰھَدَ عَلَیْہُ اللّٰہَ فَسَیُؤْتِیْہِ اَجْرًا عَظِیْمًا۝﴾ (الفتح: ۱۰)

﴿لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ فَعَلِمَ مَا

فِیْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ عَلَیْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا﴾ (الفتح: ۱۸)
﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَكَ عَلٰۤی اَنْ لَّا یُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَیْـًٔا وَّلَا یَسْرِقْنَ وَلَا یَزْنِیْنَ وَلَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا یَعْصِیْنَكَ فِیْ مَعْرُوْفٍ فَبَایِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ (المُمتحنة: ۱۲) ..... العظیم

وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ : بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ وَعَلَی اَثَرَةٍ عَلَیْنَا وَعَلٰی اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ وَعَلٰی اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا كُنَّا لَا نَخَافُ فِی اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ

وفی روایة : وَعَلٰی اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ اِلَّا اَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ فِیْهِ مِنَ اللّٰهِ بُرْهَانٌ (متفق علیه)

قرآن مجید کے اس سلسلۂ درس میں ہم قرآن حکیم کی کچھ اُن آیات اور اُن مقامات کا مطالعہ کر رہے ہیں جن میں اُس ہیئت اجتماعیہ کے مختلف پہلوؤں کے ضمن میں رہنمائی وارد ہوئی ہے جو اقامت دین' غلبہ دین یا تکبیر ربّ کی جدوجہد کے لئے قائم ہو۔ اس اجتماعیت کا ایک پہلو ہمارے سامنے آ چکا ہے کہ اس میں جو لوگ شریک ہوں ان کے مابین کیا رشتۂ اخوت' کیسا رشتۂ محبت اور کس نوعیت کی نسبتِ ولایت درکار ہے۔ اب اس اجتماعیت کی اصل جڑ اور بنیاد کے بارے میں ہمیں غور و فکر کرنا ہے اور وہ ہے اس کا ایک ڈسپلن' یعنی نظم جماعت۔ اس نظم جماعت کے وجود میں آنے کی اساس' اس کی بنیاد' اس کی جڑ کیا ہو؟ ڈسپلن کے حوالے سے ایک نسبت امیر اور مامور کے مابین قائم ہوتی ہے۔ امیر اور مامور کی یہ نسبت اسلام میں دو طرح سے وجود میں آتی ہے۔ ایک تو ہیئت سیاسیہ کے ضمن میں' جب حکومت کی تشکیل ہوتی ہے کہ جو بھی والیٔ امر' یعنی والیٔ حکومت یا مسلمانوں کا امیر المؤمنین ہے اس کے اور اس ریاست کے شہریوں کے مابین ایک نسبت ہے۔ اور اس کی ایک دوسری صورت اس جماعت کے

نظم کے اعتبار سے ہے جو اقامت دین کی جدوجہد کے لئے قائم ہو' یعنی اس کے امیر اور وہ لوگ جو اِس جدوجہد میں شریک ہیں ان کے مابین امیر اور مامور کی ایک نسبت قائم ہوتی ہے۔ اس وقت ہم درحقیقت اس دوسری نوعیت کی نسبت کے بارے میں غور کر رہے ہیں۔ اس کے ضمن میں سورۃ الصف کی آخری آیت میں ہمیں ایک رہنمائی مل چکی ہے کہ یہ نسبت کیسے وجود میں آتی ہے۔ کوئی اللہ کا بندہ اٹھ کر ایک آواز لگاتا ہے۔ جب تک نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری تھا وہ نبی یا رسول ہوتا تھا' وہ لوگوں کو پکارتا تھا' وہ مامور من اللہ بن کر آتا تھا' اور اس کے ساتھ علیحدہ سے کوئی عہد کرنا اور دستوری رشتے میں منسلک ہونا ضروری نہیں تھا' بلکہ محض اس پر ایمان لے آنے سے وہ نسبت وجود میں آ جاتی تھی۔ البتہ اقامت دین کی جدوجہد میں جس ایثار و قربانی اور جس طرح تن من دھن لگانے کا ایک تقاضا ابھرتا تھا اس کے حوالے سے ان کے مابین ایک صورت یہ بھی ہوتی تھی کہ وقت کا نبی یا وقت کا رسول کسی وقت خاص طور پر ایک صدا لگاتا تھا کہ: مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ ؟ ''کون ہے میرا مددگار اللہ کی راہ میں؟'' چنانچہ یہ الفاظ جب سورۂ آل عمران (آیت ۵۲) میں آئے ہیں تو وہاں اس سے پہلے الفاظ یہ ہیں کہ ﴿فَلَمَّا اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْھُمُ الْکُفْرَ﴾ یعنی جب عیسیٰؑ نے ان لوگوں کی طرف سے کفر کی شدت کا احساس کیا۔ معلوم ہوا کہ اب مقابلہ شدید ہونے والا ہے' اب ایک تصادم کی صورت پیدا ہونے والی ہے ﴿قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ﴾ تو انہوں نے ایک صدا لگائی کہ کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے؟ ﴿قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ ۚ﴾ حواریوں نے اس کا جواب دیا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار! ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے ایک نسبت ان کے مابین قائم ہو چکی تھی اور وہ نسبت درحقیقت ایمان کی نسبت تھی کہ حضرت عیسیٰؑ نے نبوت کا دعویٰ کیا' جنہوں نے ان کی تصدیق کی وہ ان کے ساتھی بن گئے' وہ فطری طور پر اُن کے تابع ہو گئے اور منطقی طور پر اُن پر حضرت عیسیٰؑ کی اطاعت واجب ہو گئی۔ لیکن جب وہ مرحلہ آیا

جبکہ محسوس ہوا کہ اب شدید کشمکش کا آغاز ہونے والا ہے تو انہوں نے خاص طور پر ایک ندا لگائی ''مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ؟'' جس کا ایک مثبت جواب اُن کے حواریوں نے دیا۔ بہر حال اس سے ہمیں رہنمائی ملی کہ اس جدوجہد کے لئے کسی ہیئت اجتماعیہ کے وجود میں آنے کی صورت یہ ہے کہ کوئی داعی یہ صدا لگائے' لوگوں کو پکارے' اور جو لوگ اس کی اس پکار پر لبیک کہہ کر حاضر ہو جائیں وہ اس کے ساتھی اور اعوان و انصار ہوں گے۔

اسی جانب مزید رہنمائی ہمیں سورۃ الفتح کی آخری آیت سے ملی' جس کے بارے میں کئی بار گفتگو ہو چکی ہے کہ یہی اجتماعیت جب محمد رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں وجود میں آئی تو ذہن میں رکھئے کہ اس کے بھی دو مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ یہ کہ جس نے بھی تصدیق کی حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت کی وہ فطری طور پر آپ کا ساتھی بن گیا۔ کیسے ممکن تھا کہ حضور ﷺ حکم دیں اور وہ اسے تسلیم نہ کرے! یہ تو اس کا ایک منطقی نتیجہ ہے اور ایک ایسی اظہر من الشمس بات ہے کہ جس کے لئے کسی اضافی قول و قرار اور کسی اضافی عہد و میثاق کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ جو ہیئت اجتماعیہ وجود میں آئی اس کے اجزائے ترکیبی یہی ہیں کہ ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ۭ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ﴾ یعنی ''محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں'' یا ''اللہ کے رسول محمد (ﷺ)''۔ یہ میں بحث کر چکا ہوں کہ یہ دونوں نحوی ترکیبیں یہاں ممکن ہیں' لیکن یہاں اہم بات یہ ہے کہ ﴿وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ﴾ ''اور وہ لوگ جو اُن کے ساتھ ہیں'' یہ ہیں کہ جنہوں نے ان کی رفاقت اور معیت اختیار کی ہے' جو اُن پر ایمان لائے ہیں' ان کی تصدیق کی ہے' اور اب یہ مل کر جب ایک ہیئت اجتماعیہ کی شکل اختیار کرتے ہیں تو ان کے مابین ایک نسبت امیر اور مامور کی بھی قائم ہوتی ہے۔ ایک نسبت تو بنیادی ہے رسول اور اُمتی کی' اس پر یہ اضافی نسبت ہے امیر اور مامور کی۔

اس اضافی نسبت کو نمایاں کرنے والی چیز جو ہمیں قرآن اور سنت اور سیرتِ رسول ﷺ سے ملتی ہے' اس کا عنوان ''بیعت'' ہے۔ اب اس بیعت کے سلسلے میں ہمیں سمجھنا ہے کہ اس کی اصل کیا ہے' جڑ بنیاد کیا ہے' اس کا معنی و مفہوم کیا ہے' قرآن

حکیم میں بیعت کا ذکر کہاں کہاں آیا ہے' بیعت کی کتنی انواع واقسام ہیں' سیرت النبیؐ میں اس بیعت کا کس تدریج کے ساتھ ذکر ملتا ہے؟ میں کوشش کروں گا کہ یہ سب باتیں ایک تدریج کے ساتھ مختصر ترین وقت میں آپ کے سامنے آ جائیں۔ اس ضمن میں تفصیلی مباحث میری بہت سی تقاریر میں موجود ہیں' لیکن جامعیت کے ساتھ ایک مختصر وقت میں ان مباحث کا سامنے آ جانا ان شاء اللہ بہت مفید ہوگا۔

بیعت کی حقیقت۔ سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۱۱ کی روشنی میں

اس بیعت کی اصل حقیقت پر جو آیۂ مبارکہ روشنی ڈالتی ہے وہ سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۱۱ ہے۔ بیعت کے حروفِ اصلی ''ب' ی' ع'' ہیں اور بیع وشراء کے معنی خرید و فروخت کے ہیں۔ اور یہ ذہن میں رکھئے کہ جب تک کرنسی وجود میں نہیں آئی تھی تو خرید وفروخت اصلاً مبادلۂ اشیاء کا نام تھا۔ مبادلۂ اشیاء میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ چیز اُس دوسری چیز کی قیمت ہے' اور برعکس بھی کہا جا سکتا ہے کہ نہیں' یہ دوسری چیز اُس پہلی چیز کی قیمت ہے۔ دونوں ہی شے بھی ہیں اور دونوں ہی قیمتیں بھی ہیں۔ البتہ عربی زبان مین بیع اور شراء کے دو طرفہ الفاظ کا استعمال موجود ہے۔ اس اعتبار سے شراء کے معنی ہو جائیں گے بیچنا' جبکہ بابِ افتعال سے ''اِشْتِرَاء'' خریدنے کے معنی میں آئے گا۔ سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ﴾ (آیت ۲۰۷) ''لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو بیچتے ہیں اپنی جانیں اللہ کی رضا کی تلاش میں''۔ یہاں شَـرٰی' یَشْـرِی بیچنے کے معنی میں آیا ہے اور سورۃ التوبۃ میں ''اِشْتَـرٰی'' (بابِ افتعال) خریدنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح لفظ بیع غالب استعمال کے اعتبار سے فروخت کرنے کے مفہوم میں آتا ہے۔ بائع (بیچنے والا) اور مشتری (خریدار) کے الفاظ ہمارے ہاں عام طور پر مستعمل ہیں۔ بائع وہ ہے جو بیچ رہا ہے' لیکن جب یہ بابِ تفاعل یا بابِ مفاعلہ میں آئے گا تو اِن دونوں ابواب میں ایک خاصہ تو اضافی مبادلے کا پیدا ہو جاتا ہے اور ان کا دوسرا خاصہ دو فریقوں کے مابین کسی دو طرفہ معاملے کا وجود میں آنا ہے۔ جیسے جہد سے مجاہدہ اور قتل سے مقاتلہ ہے

اسی طرح باب مفاعلہ میں بیع سے مبایعہ ہوا۔ اب مبایعہ میں جب دو فریق شریک ہو جائیں گے تو پھر وہی اشیاء کے مبادلے کی صورت بن جائے گی۔ اور اس دَور میں چونکہ کرنسی ایک علیحدہ شے معین ہوگئی ہے تو کرنسی سے کسی شے کا مبادلہ ہے۔ بہرحال قرآن مجید میں یہ بیع کا لفظ تو کثرت سے آیا ہے' لیکن سورۃ البقرۃ میں باب تفاعل سے ''تَبَایَعْتُمْ'' بھی آیا ہے۔ اور یہاں آپ دیکھیں گے کہ ''مبایعہ'' باب مفاعلہ سے بھی وارد ہوا ہے۔ تو یہ درحقیقت مبادلہ ہے' جس کے لئے ہماری زبان میں سادہ ترین لفظ ''لین دین'' ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات اور نوٹ کر لیجئے کہ ایک تو نقد بیع ہے' یعنی چیزوں کا باہمی تبادلہ ہوگیا یا کرنسی سے کسی شے کا مبادلہ ہوگیا' اور ایک ہے مستقبل کے اعتبار سے کوئی سودا کرنا۔ اس صورت میں ذرا اضافی complication آتی ہے۔ سورۃ البقرۃ میں لفظ ''تَبَایَعْتُمْ'' اسی مفہوم میں آیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَایَعْتُمْ﴾ (آیت ۲۸۲) ''جب کوئی سودا کیا کرو (جو فی الفور نہیں ہو رہا ہے) تو ضرور گواہ بنا لیا کرو''۔ اس لئے کہ یہ ایک معاہدہ ہے۔ اس کی بحث ہمارے ہاں فقہ میں ''بیع سَلم'' کے عنوان سے آتی ہے۔ بیع سَلم وہ ہے جس میں کوئی مستقبل کا سودا ہو رہا ہے۔ مستقبل کی بیع کو اسلام عام طور پر discourage کرتا ہے' اس لئے کہ اس میں کئی پیچیدگیاں ہیں اور کسی نہ کسی طور سے سود کا عنصر داخل ہو جانے کا امکان ہے۔ لہٰذا اصلاً تو اسلام چاہتا ہے کہ سودا نقد ہوا کرے۔ بیع کی بہترین صورت تو وہی ہے' البتہ انسانی تمدن کے تحت یہ ضرورت بھی پیش آتی ہے کہ کسی وقت کوئی ادھار سودا بھی ہو۔ اسلام نے اس کی صرف ایک شکل کو جائز رکھا ہے کہ مبادلے کے جو دو رُخ ہیں ان میں سے ایک شے بتمام و کمال اُسی وقت ادا ہو جائے۔ مثلاً آپ کو ماہِ مئی کے لئے گندم کا کوئی سودا کرنا ہے کہ دس ہزار من گندم دو سو روپے من کے حساب سے کوئی خرید رہا ہے اور کوئی بیچنے کا عہد کر رہا ہے تو اس گندم کی جو کل قیمت بنتی ہے وہ خریدار کے لئے اسی وقت ادا کر دینا لازم ہے' جبکہ اسے گندم ماہِ مئی میں ملے گی۔ یہ بیع سَلم کہلاتی ہے۔ اور

یہ ہے درحقیقت وہ ''مبایعت'' یا ''تبایع'' کہ اس میں ایک سودا ہو رہا ہے لیکن بیع فی الفور مکمل نہیں ہوئی' مبادلۂ اشیاء اسی وقت نہیں ہوا۔

ان چیزوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک بات اور نوٹ کر لیں کہ عربوں کے ہاں جب اس مبایعت یا تبایع کا معاملہ ہوتا تھا تو چونکہ یہ بات قول وقرار کے درجے میں ہوتی تھی' لہٰذا اس کو پختہ کرنے کے لئے ہاتھ ملانا ان کے ہاں ایک علامت کے طور پر رائج تھا کہ بات پختہ ہو گئی۔ ہوتے ہوتے اس کا استعمال نقد خرید و فروخت پر بھی ہونے لگا کہ جب کوئی سودا طے ہو جاتا اور بات پوری ہو جاتی تو اس پر بھی وہ مصافحہ کرتے۔ یہ ہاتھ کا ملا لینا درحقیقت اُس وقت اِس بات کی علامت ہوتا تھا کہ اب بات پوری ہو گئی' سودا طے ہو گیا' جو ردّ و قدح اور بحث و تمحیص ہونی تھی وہ ہو چکی۔

اب دیکھئے کہ قرآن حکیم اس بیع کا ذکر کن اسالیب میں کرتا ہے۔ قرآن مجید کسی حقیقت کی توضیح کے لئے مختلف اسلوب اختیار کرتا ہے۔ جہاں تک تجارت اور خاص طور پر اس بیع و شراء کا معاملہ ہے' اسے ہر انسان سمجھتا ہے۔ عامی سے عامی اور اَن پڑھ سے اَن پڑھ انسان بھی اس سے نابلد نہیں۔ یہ وہ بنیادی concepts ہیں کہ جن سے کوئی شخص ناواقف نہیں۔ چنانچہ دیکھئے سورۃ الصف میں اللہ تعالیٰ نے یہی الفاظ استعمال کئے۔ فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ﴾ (آیت ۱۰)

اے اہلِ ایمان! کیا میں تمہیں وہ تجارت بتاؤں جو تمہیں عذابِ الیم سے چھٹکارا دلا دے؟''

تجارت میں ہوتا کیا ہے؟ کچھ سرمایہ' تھوڑا یا کم اور کچھ محنت۔ اور اس سرمائے اور محنت کے لگانے سے مطلوب ایک نفع اور فائدہ ہوتا ہے۔ تین چیزیں اس کے لازمی اجزاء ہیں۔ چنانچہ یہاں وہ نفع سامنے رکھا گیا کہ عذاب الیم سے چھٹکارا پانا! اس عظیم نفع کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو یہ تجارت کرنی پڑے گی۔ اور جیسے تم تجارت میں سرمایہ بھی

لگاتے ہو اور محنت بھی کرتے ہو اِسی طرح اس تجارت میں بھی سرمایہ اور محنت دونوں لگیں گے۔ وہ تجارت ہے کیا؟

﴿تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝﴾ (آیت ۱۱)

''ایمان پختہ رکھو اللہ پر اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے (اس میں اپنے مال بھی کھپاؤ اور اپنی جانیں بھی) یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم سمجھو''۔

اب یہ وہ اسلوب ہے کہ جس کو عامی سے عامی انسان بھی سمجھ جائے گا۔ اس لئے کہ ان تصورات کو سمجھنے کے لئے فلسفہ و منطق پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ انسانی معاملات کے بنیادی تصورات ہیں جن کو ہر انسان جانتا ہے۔ ابھی میں نے سورۃ البقرۃ کی ایک آیت آپ کو سنائی: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۲۰۷) یعنی لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو اپنی جانیں بیچتے ہیں' اپنی صلاحیتیں' اپنی توانائیاں' اپنی قوتیں' اپنے اوقات بیچتے ہیں۔ کس لئے؟ اللہ کی رضا جوئی کے لئے۔ یہی انداز ایک حدیث میں آیا ہے۔ فرمایا: ((كُلُّ النَّاسِ يَغْدُوْ فَبَايِعٌ نَفْسَهٗ ، فَمُعْتِقُهَا اَوْ مُوْبِقُهَا)) (مسلم والترمذی) یعنی ہر انسان جب صبح کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو بیچنا شروع کرتا ہے۔ وہ کہیں کسی دفتر میں اپنی صلاحیتوں کو کھپا رہا ہے' اپنا وقت صرف کر رہا ہے' کہیں کسی کھیت میں محنت کر رہا ہے' اپنی توانائیاں کھپا رہا ہے' اپنا خون پسینہ ایک کر رہا ہے۔ شام تک وہ اپنے آپ کو بیچ رہا ہوتا ہے۔ البتہ اس کا نتیجہ مختلف نکلتا ہے۔ اپنے نفس کے بیچنے والے ایک وہ ہیں جو شام کو گھر لوٹتے ہیں تو گناہوں کی گٹھڑی بھی ساتھ لے کر آتے ہیں' اپنے نفس کو تباہ و برباد کر کے لوٹتے ہیں' اس کے لئے جہنم کا پروانہ حاصل کر کے واپس آتے ہیں۔ اور ایک وہ ہیں جو جہنم سے رہائی کا پروانہ لے کر آتے ہیں۔ فَمُعْتِقُهَا اَوْ مُوْبِقُهَا۔ وہ بھی ہیں جو گردن کو چھڑا کر لاتے ہیں اور وہ بھی ہیں کہ جو اِس کو ہلاکت کے حوالے کر کے آتے ہیں۔

دین کی اس کلی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے وہی انداز سورۃ التوبۃ میں اختیار کیا گیا: ﴿اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ؕ﴾ ''یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں اہل ایمان سے ان کی جانیں بھی اور ان کے مال بھی بسبب اس کے کہ ان کے لئے جنت ہے''۔ یعنی اللہ نے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔ اب آپ یہ جان لیجئے کہ یہ بیع سَلم ہوگی۔ یہ مبادلہ یہاں نہیں ہو رہا۔ جنت تو آخرت میں ملے گی' جبکہ جان و مال یہاں حوالے کرنے ہوں گے۔ ایسی خرید و فروخت کو بیع سَلم اسی لئے کہتے ہیں کہ ایک شے فوری طور پر سپرد کر دی جاتی ہے۔ لفظ تسلیم ہم اردو میں بھی سپرد کر دینے اور حوالگی کے مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔ تو ''بیع'' کا ایک طرف کا پہلو اگر مکمل حوالہ ہو جائے' اس کی تسلیم ہو چکے' وہ بیع سَلم ہے۔ اب اس کا جو بھی دوسرا عوض ہے وہ کسی وقت معینہ پر ملے گا۔ اسی طرح کی ایک مبایعت یا تبایع کا معاملہ ہے جو اللہ تعالیٰ اور اہل ایمان کے مابین ہوا۔ اب اس بیع کا جو نتیجہ نکلتا ہے وہ کیا ہے: ﴿یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ ۣ﴾ ''وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں' پس مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں''۔ وہ جان جو اللہ کو دے چکے' اب وہ اس کو کھپا رہے ہیں' لگا رہے ہیں اللہ کے راستے میں۔ نوٹ کیجئے کہ یہاں قتال کا لفظ آیا ہے جو خاص ہے' جبکہ جہاد عام ہے' تو جہاں خاص کا ذکر آئے گا وہاں عام خود بخود اس میں شامل سمجھا جائے گا' جیسے ہر رسول تو نبی ہے ہی' ہر نبی رسول نہیں ہے' لہٰذا جہاں لفظ رسول آ جائے وہاں نبوت understood ہے' اس کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں بھی خاص اور آخری بات ''قتال'' کا ذکر ہو گیا' جہاد اس میں بدرجۂ اُولیٰ مراد ہے۔ اب وہ اس جہاد اور ''قتال'' میں اپنی جانیں بھی کھپا رہے ہیں' اپنے مال بھی کھپا رہے ہیں۔ ''جہاد'' کی طرح ''قتال'' بھی جان اور مال دونوں کو محیط ہے۔ انسان کے پاس سب سے قیمتی متاع جان ہے' جب وہ اس کو ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں حاضر ہو جاتا ہے تو بر سبیل تغلیب یہاں از خود مال بھی مراد ہو گیا۔ لہٰذا قتال میں جہاد بالمال والنفس گویا کہ یہاں پورا کا پورا مندرج ہے' understood ہے۔

سلسلۂ جہاد و قتال کے ضمن میں آخری شے کا ذکر کیا جا رہا ہے اور ''ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں'' کے مصداق باقی ساری چیزیں اس میں از خود مذکور ہو گئیں۔ ﴿فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ﴾ ''وہ قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں''۔ جان کا سودا تو پہلے کر چکے' اب تو صرف اس کی حوالگی باقی تھی' سو وہ بھی ہو چکی۔

اللہ تعالیٰ کی اہل ایمان سے بیع و شراء بیع سلَم ہے' ایک ادھار سودا ہے کہ جان و مال تو یہاں سپرد کر دیئے ہیں اور جنت کا وعدہ آخرت میں ہے اور ادھار سودے پر انسان کے دل میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ تردّد پیدا ہوتا ہے۔ اب یہ ادھار تو ہے بھی اتنا بڑا ادھار کہ یہاں صرف سالوں اور مہینوں کا مسئلہ نہیں' ایک عالَم اور دوسرے عالَم کا فرق ہے۔ اگرچہ اِس عالَم سے اُس عالَم میں منتقلی اسی وقت فی الفور بھی ہو سکتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں وقت لگ جائے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ابھی اس دنیا میں مزید کتنا عرصہ رکھنا اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کے فیصلے میں ہے۔ لہٰذا اس ادھار سودے پر طبیعت میں ایک اضطراب اور تردّد کا پیدا ہونا طبعی اور فطری ہے۔ اور پھر یہ وہ چیز ہے کہ جس پر شیطان کو وسوسہ اندازی کا موقع ملتا ہے کہ تم تو یہاں اپنا سب کچھ کھپا رہے ہو' پتہ نہیں وہ آخرت ہو گی بھی کہ نہیں ہو گی! تم نے کسی پر اعتماد کر کے یہ فیصلہ کیا ہے لیکن پتہ نہیں واقعہ کیا ہے! یہ ہے اصل میں شیطان کا ڈالا ہوا وسوسہ جس کو پس منظر میں رکھیں گے تب سمجھ میں آئے گا کہ اللہ کے اس وعدے کی حقانیت پر یہاں اتنا زور کیوں دیا جا رہا ہے اور اتنا تاکیدی انداز کیوں اختیار کیا گیا ہے: ﴿وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ﴾ یعنی یہ وعدہ اللہ کے ذمے ثابت ہے' شدنی' قطعی' یقینی' حتمی وعدہ ہے' تورات میں' انجیل میں اور قرآن میں۔ ''وَعْدًا عَلَيْهِ'' میں ''علیٰ'' کا صلہ جو آیا ہے اس میں انتہائی زور ہے کہ یہ وعدہ اس کے ذمے ہے اور یہ وعدہ اس پر ثابت ہے' یہ قطعی ہے' یہ حتمی ہے' یہ یقینی ہے۔ اور اس کی تین مرتبہ توثیق ہو چکی ہے۔ اور تین کیا' اس کی توثیق تو ہزاروں بلکہ لاکھوں مرتبہ ہوئی۔ اگر وہ روایت درست ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء آئے ہیں' تو ہر نبی نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس وعدے کی توثیق کی

نے کی ہے! یہ سودا کرنے کے بعد ملول کیوں ہو گئے؟ غمگین کیوں ہو گئے؟ تمہاری طبیعت میں انقباض کیوں آ گیا؟ کیا تمہیں اللہ کی بات پر یقین نہیں؟ تم کہیں بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا تو نہیں ہو؟ یا تمہارا ''ویلیوسٹرکچر'' کا معاملہ ابھی واقعتاً پختہ نہیں ہوا تھا اور یہ بات تم نے شعوری طور پر طے نہیں کی تھی کہ ہم دنیا دے کر آخرت قبول کر رہے ہیں؟ سورۃ الاعلیٰ میں فرمایا گیا: ﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۞ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۞﴾ ''تم اس دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی ہے''۔ مطلوب یہ ہے کہ اس بات پر انسان کا دل مطمئن ہو جائے۔ اگر ایک وقت میں انسان اس کو قبول کر لے' اختیار کر لے یہ اور بات ہے اور اس پر دل کا جم جانا اور دل کا ٹھک جانا دوسری بات ہے۔ ہمارے منتخب نصاب میں سورۂ حٰمٓ السجدۃ کے درس کا آغاز ان الفاظِ مبارکہ سے ہوتا ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ ''جنہوں نے کہا ہمارا ربّ اللہ ہے' پھر اس پر جم گئے''۔ استقامتِ عملی درحقیقت استقامتِ قلبی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بالفعل جم جانا اسی وقت ممکن ہو گا جب کہ دل ٹھک چکا ہو۔ اسی کو حضور ﷺ نے فرمایا: ((قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ)) ''کہو میں ایمان لایا اللہ پر' پھر اس پر جم جاؤ''۔ اگر ایمان میں ضعف ہو گا اور استقامتِ باطنی نہیں ہو گی تو اب انشراح کیسے ہو گا؟ ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی وعدہ کر بیٹھا ہو' لہٰذا لگا بندھا کچھ ساتھ چل بھی رہا ہو' اپنی عزتِ نفس کے تحفظ میں کچھ نہ کچھ بھاگ دوڑ بھی کر رہا ہو' کبھی کوئی بات مان بھی لیتا ہو' لیکن اندر کی کیفیت وہ نہ ہو جس میں بشاشت اور استبشار ہو۔ چنانچہ جس طرح سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۞﴾ ''اور بشارت حاصل کرو اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے''۔ اسی طرح یہاں فرمایا گیا: ﴿فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ۭ﴾ تم اپنے سودے پر خوشیاں مناؤ! تمہارے چہرے تو دمکنے چاہئیں۔ تمہیں تو اس پر جشن منانا چاہئے۔ تم نے وہ سودا کیا ہے کہ جس سے بڑا سودا کوئی نہیں۔ تم نے اپنے جسم و جان کی وہ قیمت وصول کی ہے جس سے بڑی قیمت کوئی نہیں۔ تم نے جنت کے عوض

سودا کیا ہے' یہ کوئی معمولی بات نہیں۔تم نے اپنی جان اور مال کا جو سودا کیا ہے اس کی جتنی بڑی قیمت تمہیں ملی ہے اس پر تو تمہیں خوش ہونا چاہئے۔

﴿وَذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ﴾ اور جان لو کہ یہی ہے بڑی کامیابی! دنیا کا کوئی سودا ایسا نہیں ہے کہ جو اِس کے مقابلے میں آ سکے۔دنیا و مافیہا اس کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ یہ ہے وہ بیع جو اقامتِ دین کی جدوجہد کے لئے کی گئی ہے۔''جہاد و قتال'' اقامت دین کی اس جدوجہد کا جامع عنوان ہے۔اس میں جان لگتی ہے' مال کھپتا ہے' یہاں تک کہ جان کے جانے کا رسک لے کر آدمی کو میدان میں اترنا پڑتا ہے۔لہٰذا اگر یہ سودا شعوری طور پر پہلے کر لیا گیا ہو اور اس پر دل ٹھک چکا ہو تو گاڑی ہمواری کے ساتھ رواں دواں رہے گی' لیکن اگر یہاں اس میں کوئی کمی ہے تو پھر قدم قدم پر رکاوٹ آئے گی۔وہ رکاوٹ اندرونی اور داخلی ہوتی ہے جس کا ظہور خارج میں بھی ہو کر رہے گا۔

اللہ اور بندے کے درمیان ہونے والی اس بیع میں اللہ درحقیقت مشتری یعنی خریدنے والا ہے اور بندۂ مؤمن بائع یعنی بیچنے والا ہے۔مبایعت ان کے مابین ہے' لیکن عالمِ واقعہ میں اللہ تعالیٰ ہمارے سامنے موجود نہیں۔ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے غیب میں ہے یا یہ کہ ہم اس سے غیب میں ہیں۔لہٰذا اب بالفعل یہ معاملہ اس طرح ہوتا ہے کہ کوئی انسان دنیا میں اس کے نمائندے کی حیثیت سے یہ سودا کرتا ہے۔جب تک نبوت و رسالت جاری رہی وہ نمائندہ نبی اور رسول ہوتا تھا۔نبوت و رسالت کا سلسلہ بند ہونے کے بعد اب یہ نمائندہ وہ شخص ہوگا جو نبوی منہاج پر دین کی دعوت کے لئے کھڑا ہو' اقامت دین کے لئے کمر کس کے میدان میں آئے اور ندا لگائے: مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ۔کون ہے میرا مددگار اللہ کے راستے میں؟ جو لوگ اس کی پکار پر لبیک کہیں ان کے اور اس داعی کے مابین اب یہ معاہدہ ہوگا اور بات پختہ کرنے کے لئے علامت کے طور پر مصافحہ بھی ہوگا۔اس ''مصافحہ'' (بیعت) کا ذکر اب سورۃ الفتح میں ہو رہا ہے۔

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ﴾ کے مابین جو نسبت قائم ہوئی اس نے جو

ظاہری صورت اختیار کی وہ بیعت کی شکل ہے جو صحابہ کرامؓ نے محمد رسول اللہ ﷺ سے کی ہے۔ یہ بات میں نے بارہا کہی ہے کہ حضور ﷺ کے معاملے میں یا کسی نبی کے معاملے میں اس بیعت کی چنداں ضرورت نہیں ہے' اس لئے کہ نبی اور اُمتی یا رسول اور اُمتی کی نسبت اس سے اہم تر ہے۔ اُمّتی ہر حال میں مطیع ہے۔ ہمارے ہاں تو اُمتی کا تصور بگڑ چکا ہے' لیکن کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو اس میں اشتباہ ہوسکتا تھا کہ محمد ﷺ کو رسول مان لینے کا مطلب کیا ہے؟ یہی کہ آپؐ کو مطاع ماننا! یہ تو سابقہ انبیاء کرام کی دعوت بھی قرآن مجید میں ان الفاظ میں آئی ہے: ﴿اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاتَّقُوْہُ وَاَطِیْعُوْنِ ۝﴾ (نوح:۳) ''یہ کہ اللہ کی بندگی کرو' اس کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو''۔ سورۃ الشعراء میں حضرت نوح' حضرت ہود' حضرت صالح' حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام' سب کی دعوت کے ضمن میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ ۝﴾ ''میں تمہارے لئے ایک امانت دار رسول ہوں' لہٰذا اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو''۔ اس اعتبار سے وہاں تو وہ اصل بنیادی نسبت زیادہ قوی اور مضبوط موجود ہے' لیکن میں اس بات پر پوری طرح انشراحِ صدر رکھتا ہوں کہ بیعت کا معاملہ حضور ﷺ نے اُمت کی رہنمائی کے لئے کیا ہے۔ آپؐ کو بیعت لینے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ لیکن آپؐ کے بعد آئندہ تو نبی اور اُمتی کی یہ نسبت کبھی قائم نہیں ہوگی۔ وہ تو ہمیشہ ہمیش کے لئے تا قیامِ قیامت قائم ہو چکی محمد رسول اللہ ﷺ اور ہر کلمہ گو کے مابین۔ لیکن جب بھی کوئی عملی جدوجہد ہوگی' کوئی اجتماعیت تشکیل پائے گی' کوئی تعیین ہوگی کہ کون لوگ اعوان و انصار ہیں اور معین ہوگا کہ ان کی کتنی قوت ہے' تو اس کے لئے کوئی نہ کوئی علامت اور اس کا کوئی نظام ہونا لازم ہے۔ چنانچہ یہ ہے وہ نسبتِ بیعت کہ جو اَب اُمت کے اندر چلی ہے۔ اُمت کی پوری تاریخ میں آپ کو نظر آئے گا کہ جو بھی اجتماعی ہیئت وجود میں آئی وہاں بیعت کا نظام اختیار کیا گیا۔ اجتماعیت کی بلند ترین اور نمایاں ترین صورت حکومت کا قیام ہے' وہ بھی بیعت کی بنیاد پر قائم ہوتی رہی۔ اس کی خفی ترین صورت

سلسلۂ ارشاد و اصلاح ہے' اس کے لئے بھی بیعت کا نظام رائج ہے۔ کبھی حکومت کے خلاف بغاوت کی تحریک اٹھی تو وہ بھی بیعت کی بنیاد پر اٹھی۔ چنانچہ اجتماعیت درحقیقت جس شے کا نام ہے وہ اسلام میں بیعت ہی کی بنیاد پر وجود میں آتی ہے۔

سورۃ الفتح میں بیعتِ رضوان کا ذکر

وہ بیعت جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ سے صحابہ کرامؓ نے حدیبیہ کے مقام پر کی' اس کا ذکر سورۃ الفتح کی آیت ۱۸ میں صراحت کے ساتھ آیا ہے: ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ ''اللہ تعالیٰ راضی ہو چکا اہل ایمان سے جبکہ (اے نبیؐ) وہ آپ سے بیعت کر رہے تھے درخت کے نیچے''۔ فعل ماضی پر جب ''قَدْ'' آتا ہے تو اس کے قطعی' حتمی اور یقینی ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ ﴿فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾ ''تو اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا جو کچھ کہ ان کے دلوں میں تھا''۔ اللہ تعالیٰ اُن کے دلوں کی کیفیت کو خوب جانتا تھا ﴿فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ﴾ ''اس لئے اس نے اُن پر سکینت نازل فرمائی''۔ یعنی قلبی اطمینان عطا فرما دیا۔ حالانکہ معلوم تھا کہ ہم نہتے ہیں' ہم احرام باندھے ہوئے ہیں' ہم پر اچانک ہجوم ہو جائے' ایک دم حملہ ہو جائے تو کیا ہو گا؟ لیکن نہیں! انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اطمینان اور سکون کی کیفیت نصیب ہو گئی۔ اس لئے کہ وہ تو جان دینے کا سودا پہلے سے کئے ہوئے ہیں' بالکل مطمئن ہیں' دل ٹھکا ہوا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ اس سے بڑا سودا کوئی نہیں۔ وہ تو جان دیتے وقت ''فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ'' پکارنے والے لوگ تھے کہ ربّ کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا! ان کا معاملہ اس طرح کا ڈانواں ڈول معاملہ نہیں تھا۔ اس کی طرف اشارہ ہو رہا ہے: ﴿فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۞﴾ ''تو اللہ نے ان پر سکینت نازل فرمائی اور ان کو بدلے میں قریبی فتح عطا فرمائی''۔ سورۃ الفتح کے تفصیلی درس میں مَیں یہ بیان کر چکا ہوں کہ اس فتح سے مراد صلح حدیبیہ کی فتح بھی ہے اور فتح خیبر بھی ہے جو اس کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ نے بطورِ انعام عطا فرمائی اور جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بہت سا مالِ غنیمت فراہم فرمایا۔

اہل ایمان کی بیع وشراء کس کے ہاتھ پر؟

سورۃ الفتح کی آیت نمبر ۱۰ میں وہ اصل حقیقت بیان ہو رہی ہے کہ بات سمجھ لو کہ دیتے ہیں
اصل میں یہ بیع وشرا کس کے ہاتھ پر ہے' کس کے مابین ہو رہی ہے' اس مبایعت کے ''نقض غ
فریق کون ہیں! فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ ؕ﴾ ''(اے نبیؐ!) نَقَضَتْ
جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں' حقیقت میں وہ اللہ سے بیعت کر رہے ہیں''۔ سودا جس نے
اللہ سے ہوا ہے۔ تبایع یا مبایعت بندۂ مؤمن اور اللہ کے مابین ہے۔ نبی اس وقت عالم دیئے''۔
واقعہ میں اللہ کی طرف سے وصول کنندہ (receiver) ہے۔ یہ جو نظم قائم ہوا ہے اس ہے'نگ
میں اب ان کی حیثیت امیر کی اور ان کے ساتھیوں کی حیثیت مامورین کی ہے۔ یہ سودا جگہ''ش
کرنے والے اپنے جان اور مال اب ان کے حکم سے صرف کریں گے' ان کے مطالبے یعنی ایک
پر حاضر کر دیں گے' جیسے اور جب وہ چاہیں گے پیش کر دیں گے۔ لیکن یہ کہ اصل سودا رہا ہے' ا
اللہ کا اور بندے کا ہے۔ ﴿یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ﴾ ''اللہ کا ہاتھ ہے ان کے ہاتھوں کی تھی ک
کے اوپر''۔ اب یہاں وہ بیعت کا پورا نقشہ کھینچ دیا گیا' کیونکہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیعت کا حکم
ہوتی ہے۔ بیعت کرنے والے کا ہاتھ اوپر ہوتا ہے اور بیعت لینے والا کا نیچے ہوتا ہے۔ ایک اند
لیکن یہاں فرمایا کہ ایک اور تیسرا ہاتھ بھی ہے۔ ان کے ہاتھوں کے اوپر ایک اور ہاتھ اندر ہی
ہے اور وہ اللہ کا ہاتھ ہے۔ تو یہ ایک سہ فریقی (tripartite) معاہدہ ہے۔ عالم واقعہ نہیں چل
میں یہ بیعت محمد رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک پر ہو رہی ہے اور حقیقتاً یہ بیعت اللہ کہ یہ تو
سے ہو رہی ہے ﴿یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ﴾ ''اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے''۔ یَنْکُثُ
﴿فَمَنْ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنْکُثُ عَلٰی نَفْسِہٖ﴾ ''اب جو اس عہد کو توڑے گا اس کا ذات پ
عہد شکنی کا وبال اسی پر ہوگا''۔ اس بیعت کا یہ رُخ جو ہے بہت اہم ہے۔ نوٹ کیجئے میں کہ
عربی زبان میں حروف کے اعتبار سے جو الفاظ مماثل اور مشابہ ہوتے ہیں ان کے معانی اس پر ا
میں اور ان کی حقیقت میں بھی ایک بہت گہرا ربط ہوتا ہے اور ان میں ثقالت اور لطافت چکے؟ ا
کی بھی ایک نسبت ہوتی ہے۔ نقض کے معنی ہیں توڑ دینا' ختم کر دینا۔ یہود کے بارے بھی یہ ش
میں فرمایا: ﴿فَبِمَا نَقْضِھِمْ مِّیْثَاقَھُمْ﴾ ''اس وجہ سے کہ یہ اپنے عہد معاہدے کو توڑ جس
تو آپ

سمجھ لو کہ دیتے ہیں''۔ نقضِ عہد' نقضِ میثاق کی ترکیب ہم استعمال کرتے ہیں۔ ایک اصطلاح ...ت کے ''نقضِ غزل'' بھی ہے جو اِس آیتِ قرآنی سے ماخوذ ہے: ﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي ...ے نبیؐ!) نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا ۚ﴾ (النحل: ۹۲) ''اس بڑھیا کی مانند نہ بن جاؤ ...'۔ سودا جس نے اپنے محنت سے کاتے ہوئے سوت کو توڑ دیا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ...ت عالم دیئے''۔ لفظ ''نکث'' بھی دراصل 'نَقَضَ'' کے مشابہ ہے۔ ''ن'' دونوں میں مشترک ...ہے اس ہے' نکث میں ''ق'' کے بجائے ''ک'' ہے' اسی طرح ''ض'' ثقیل حرف ہے تو اس کی ...۔ یہ سودا جگہ ''ث'' ہے جو خفیف ہے۔ ''نکث'' کے معنی بھی توڑ دینا ہیں' لیکن یہ خفیف ہے۔ ...مطالبے یعنی ایک اعلانیہ بات نہیں ہے' بلکہ انسان اندر ہی اندر ٹوٹ رہا ہے' قول و قرار سے پھر ...صل سودا رہا ہے' اندر ہی اندر پسپائی ہو رہی ہے۔ وہی بات جو مَیں نے ارتداد کے ضمن میں عرض ...ے ہاتھوں کی تھی کہ ایک ارتداد ظاہری ہے' کھلم کھلا ہے' اس کے اوپر تو مفتی کا فتویٰ لگے گا' قاضی ...کر بیعت کا حکم لگے گا اور حد جاری ہو جائے گی' لیکن ایک وہ ارتداد ہے جو اندر ہی اندر ہو رہا ہے' ...وتا ہے۔ ایک اندرونی پسپائی (retreat) ہے' آدمی اپنے نقشِ قدم سے لوٹ رہا ہے۔ یہ جو ...اور ہاتھ اندر ہی اندر والا ارتداد ہے یہ نفاق ہے' جس پر قاضی کا حکم نہیں لگ سکتا' مفتی کا فتویٰ ...عالم واقعہ نہیں چل سکتا۔ نفاق پر تو محمد رسول اللہ ﷺ نے کسی حکم کا کوئی اجراء نہیں کیا۔ اس لئے ...یعت اللہ کہ یہ تو ایک باطنی حقیقت ہے۔ یہی معاملہ یہاں نکث کا ہے ﴿فَمَنْ نَّكَثَ فَإِنَّمَا ...ہے'' يَنْكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِ﴾ اب جو اِس عہد کو توڑے گا اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ہی ...گا اس کی ذات پر ہوگا۔ لہٰذا اپنے آپ کو ٹٹولتے رہا کرو' دیکھتے رہا کرو۔ جیسے ہم اپنے محاورے ...وٹ کیجئے میں کہتے ہیں کہ اپنے گریبانوں میں جھانکتے رہا کرو۔ اپنے دلوں کا جائزہ لیتے رہو کہ ...کے معاملہ اس پر انشراح ہے' انبساط ہے' استبشار ہے یا انقباض ہو چکا ہے؟ کہیں پسپائی تو نہیں کر ...ور لطافت چکے؟ اندر ہی اندر کہیں اس قول و قرار کی خلاف ورزی تو نہیں ہو رہی؟ جان لو کہ جو کوئی ...کے بارے بھی یہ شکل اختیار کرے گا وہ اس کا سارا وبال درحقیقت اپنے اوپر لے گا۔ اس لئے کہ ...رے کو تو جس کے ہاتھ پر بیعت کی جا رہی ہے اس نے تو آپ سے کوئی چیز طے ہی نہیں کی۔ سودا تو آپ کا اللہ کے ساتھ ہوا تھا' قیمت اسی نے دینی ہے' محمد رسول اللہ ﷺ نے تمہیں

کوئی قیمت نہیں دینی' قیمت تو تم اللہ سے لو گے۔ تمہارا عہد' قول وقرار اور مبایعت تو اللہ سے ہوئی ہے۔ تم اگر اپنے عہد سے پھرے تو سارا وبال اپنے اوپر لو گے' ان کا کوئی نقصان نہیں ہوگا' انہیں کسی طرح کا کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ اس معاملے میں ذمہ داری ساری تمہاری ہے۔

اب آگے وہی لفظ ''اَوْفٰی'' فعل کی صورت میں آ گیا ہے (اَوْفٰی' یُوْفِیْ' اِیْفَاءً)۔ سورۃ التوبۃ کی مذکورہ بالا آیت میں ''اَوْفٰی'' افعل التفضیل کا صیغہ تھا' یعنی سب سے بڑھ کر وفا کرنے والا۔ یہاں یہ فعل ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ فرمایا: ﴿وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۞﴾ ''اور جس نے اس عہد کو پورا کیا جو اُس نے اللہ سے کیا ہے تو اللہ تعالیٰ عنقریب اسے بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا''۔ یہ ہے بیعت کی اصل حقیقت کہ جس سے ایک اجتماعیت وجود میں آتی ہے اور اس میں امیر اور مامور کی نسبت قائم ہوتی ہے۔

سورۃ الممتحنۃ میں ''بیعت النساء'' کا تذکرہ

بیعت کا لفظ قرآن مجید میں چوتھی بار سورۃ الممتحنۃ میں آیا ہے جہاں خواتین کی بیعت کا ذکر ہے۔ سورۃ الممتحنۃ' سورۃ الفتح کے بعد نازل ہوئی ہے' جس میں صلح حدیبیہ کا ذکر ہے۔ صلح حدیبیہ میں طے ہو گیا تھا کہ اگر کوئی مسلمان مکّہ سے مدینہ آ جائے گا تو اسے واپس کرنا ہوگا۔ اسی ضمن میں اب خواتین کا مسئلہ پیدا ہوا جو ایک جداگانہ حیثیت کا معاملہ تھا۔ اس سلسلے میں خاص طور پر یہ سورۃ الممتحنۃ نازل ہوئی۔ بہرحال میں اس پوری بحث میں نہیں جا رہا' صرف یہ آیت نوٹ کر لیجئے کہ قرآن مجید میں بیعت کا ذکر چوتھی بار اس آیت میں آیا ہے۔ فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ﴾ ''اے نبیؐ! جب آپ کے پاس مؤمن خواتین بیعت کرنے کے لئے آئیں'' ﴿عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا﴾ ''اس بات پر کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں کریں گی'' ﴿وَّلَا يَسْرِقْنَ﴾ ''اور چوری نہیں کریں گی'' ﴿وَلَا يَزْنِيْنَ﴾ ''اور بدکاری نہیں کریں گی'' ﴿وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ﴾ ''اور اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں

گی'' ﴿وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ﴾ ''اور اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان سے کوئی بہتان گھڑ کر نہیں لائیں گی'' ﴿وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ﴾ ''اور کسی معروف کام میں جو حکم آپ دیں گے اس سے سرتابی نہیں کریں گی'' ﴿فَبَايِعْهُنَّ﴾ ''تو (اے نبیؐ!) ان کو بیعت کر لیجئے!'' ان کی بیعت قبول فرما یئے۔ ﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ ۖ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ سے ان کے لئے مغفرت طلب کیجئے'' ﴿إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ غفور ہے' رحیم ہے''۔

یہ قرآن حکیم کے چار مقامات ہو گئے جن میں بیعت کا لفظ آیا ہے۔ ان میں سے سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۱۱ بیعت کی اصل حقیقت کو واضح کر رہی ہے' اور تین آیات میں لفظ بیعت کا ایک اصطلاح کے طور پر ذکر ہے۔

سیرت النبیؐ سے بیعت کا ثبوت

بیعت کے ضمن میں ہمیں سیرت النبیؐ سے جو طرزِ عمل ملتا ہے وہ ایک بالکل فطری معاملہ ہے۔ مکی دَور میں اہل مکہ میں سے جو لوگ اسلام لائے سیرت میں ہمیں ان سے کسی بیعت کا ذکر نہیں ملتا (میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ان سے حضور ﷺ نے بیعت نہیں لی' لیکن ذکر نہیں ملتا) سیرت النبیؐ میں حضراتِ ابوبکر' عمر اور حمزہ رضی اللہ عنہم کے ایمان لانے کے واقعات بڑے اہم ہیں اور ان کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے' لیکن ان کی تفصیلات میں کہیں بھی بیعت کا لفظ نہیں آتا۔ البتہ اگر کوئی شخص باہر سے آیا اور اس نے آکر اسلام کا اظہار کیا' وہ اسلام لایا تو اس کے ضمن میں روایات مل جاتی ہیں کہ پھر وہ مصافحہ اور قول و قرار بھی ہوا' اور اسے بیعتِ اسلام کہتے ہیں۔ یہ بیعتِ اسلام مکی دَور میں ثابت ہے' لیکن اہل مکہ سے نہیں' باہر سے آنے والوں سے۔ اس کے بعد ایک بیعت نظمِ جماعت' ڈسپلن اور سمع و طاعت کی بھی سیرتِ طیبہ سے ثابت ہے' لیکن اس کا بھی ہمیں مکہ والوں سے پورے مکی دَور میں کہیں ثبوت نہیں ملتا۔ میں پھر عرض کروں گا کہ کسی شے کا عدمِ ثبوت اس کے عدمِ وجود کو مستلزم نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی واقعہ ہوا ہو لیکن مذکور نہ ہو۔ بہرحال واقعہ یہی ہے کہ اس کا ذکر نہیں ملتا۔ لیکن مدینہ والوں سے دو

اہم بیعتیں محمد رسول اللہ ﷺ نے لی ہیں۔ ایک سن ۱۱ نبوی میں اور دوسری سن ۱۲ نبوی میں۔ سب سے پہلے چھ افراد ایمان لائے تھے' ان کے ضمن میں کسی بیعت کا ذکر نہیں۔ یہ اغلباً سن ۱۰ نبوی ہی کا واقعہ ہے' وہی سال کہ جس میں آپؐ نے طائف کا سفر کیا تھا۔ وہاں سے آپؐ واپس آئے تو اس کے فوراً بعد جو موسمِ حج آیا اس میں مدینہ کے چھ افراد حضور ﷺ پر ایمان لائے۔ لیکن اس وقت بھی کسی بیعت کا ذکر نہیں ہے۔ اگلے سال وہ بارہ تھے۔ پہلے سال والے چھ میں سے ایک صاحب نہیں آئے تھے' ان میں سے پانچ تھے اور سات مزید تھے۔ جب بارہ افراد نے اسلام کا اظہار کیا تو پہلی بیعت ہوئی۔ اس کو بیعت عقبہ اُولیٰ کہتے ہیں۔ اس بیعت کے الفاظ تقریباً وہی تھے جو کم و بیش دس برس بعد بیعت النساء کے ضمن میں نازل ہوئے اور ابھی ہم نے سورۃ الممتحنۃ کی آیت میں پڑھے ہیں۔ گویا اس بیعت میں کسی نظم جماعت کا ایک بیج تو موجود ہے' حکم ماننے کا اقرار ہو رہا ہے کہ جو بھی نیکی کی بات آپؐ فرمائیں گے ہم مانیں گے' لیکن اس میں نظمِ جماعت' سمع و طاعت اور اس کے مختلف لوازم کو ظاہر نہیں کیا گیا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جیسے گٹھلی کے اندر پورا درخت اور بیج کے اندر پورا پودا موجود ہوتا ہے اسی طرح یہ لوازم اسی بیعت میں بالقوّۃ (potentially) موجود ہیں۔ بعد میں اُمت میں جو بیعت ارشاد کا سلسلہ چلا اس کے لئے اس بیعت کو بطور سند اور بطور دلیل قبول کیا گیا کہ اس میں شرک سے اجتناب' چوری سے اجتناب' بدکاری سے اجتناب' قتلِ اولاد سے اجتناب اور بہتان طرازی سے اجتناب وغیرہ کا وعدہ ہے۔ چنانچہ اس کو بیعت توبہ بھی کہا جاتا ہے' بیعت ارشاد بھی اور بیعت اصلاح بھی۔

تو یہ جو خواتین کی بیعت قرآن میں مذکور ہے یہی بیعت ہمیں بیعتِ عقبہ اُولیٰ کی صورت میں سیرت النبیؐ میں ملتی ہے اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مذکور ہے۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ بیعت عقبہ اُولیٰ اور بیعت عقبہ ثانیہ دونوں بیعتوں میں موجود تھے۔ ابھی ہم جو بات سمجھ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ بیعت درحقیقت کسی نظم کا ہیولیٰ اپنے اندر کم سے کم ظاہری اور نمایاں طور پر نہیں رکھتی' بلکہ ہم یہ

کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح ایمان بالرسالت کے اندر اس کے پورے مضمرات موجود ہیں کہ جب آپؐ کو رسول مان لیا' ایمان لے آئے تو اطاعت تو کرنی ہے' اسی طرح اس کا صرف ایک تھوڑا سا اظہار کر دیا گیا کہ آپ ہمیں جو حکم بھی دیں گے اس کی نافرمانی نہیں کریں گے۔ اس بیعت کے وقت اہل مدینہ نے کہا تھا کہ ہمیں اپنا کوئی جان نثار' اپنا ساتھی دیجئے جو ہمیں قرآن پڑھائے۔ حضور ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ کر دیا اور بعد میں کچھ دنوں کے بعد حضرت عبداللہ بن اُمِّ مکتوم رضی اللہ عنہ کو بھی بھیجا۔ ان حضرات کی تعلیم اور تبلیغ سے اب وہاں پر جو انقلاب آیا تو اگلے سال ۷۲ مَرد اور ۳ عورتیں آئیں اور ان ۷۵ افراد نے جو بیعت کی وہ ہے بیعتِ عقبہ ثانیہ' اور وہ سرتاسر نظمِ جماعت کی بیعت ہے۔

اس کی وجہ بھی سمجھ لیجئے کہ حضور ﷺ نے یہ بیعتِ جماعت مکّہ والوں سے کیوں نہیں لی؟ اس کا ایک سبب بالکل ظاہر و باہر ہے کہ حضور ﷺ وہاں خود موجود ہیں' ابھی کوئی نظم علیحدہ سے قائم کرنے کی ضرورت نہیں' کسی اور کو امیر بنانے کا سوال نہیں۔ وہ chain ابھی وجود میں نہیں آ رہی کہ ایک کے بعد دوسرا اور اس کے بعد تیسرا امیر مقرر کیا جائے۔ حضور ﷺ خود موجود ہیں۔ لہٰذا جو چیز از خود ہو رہی ہو اس کے لئے خواہ مخواہ کے تکلف اور تصنع کی کوئی ضرورت نہیں۔ چنانچہ جیسے مکّہ والوں سے بیعتِ اسلام ثابت نہیں' اسی طرح ان سے کوئی بیعت سمع و طاعت بھی ثابت نہیں۔ اور جس طرح باہر سے آنے والے اسلام لائے تو ان کے لئے بیعت کا ذکر مل گیا اسی طرح مدینہ والے آئے تو ان سے بیعتِ سمع و طاعت لی گئی۔ اور یہ بیعتِ سمع و طاعت بھی شروع میں نہیں لی گئی' بلکہ جب وہاں ایک ہیئتِ اجتماعیہ کے قیام کی ضرورت پیش آ گئی کہ اب دو چار آدمیوں کی بات نہیں ہے' ۷۲ افراد ہیں' تو ان سے بیعت سمع و طاعت لی گئی اور ان کے اندر حضور ﷺ نے بارہ نقیب مقرر فرمائے۔ یہ نقیب کون تھے؟ یہ حضور ﷺ کے نامزد کردہ تھے اور وہاں پر حضور ﷺ کی طرف سے ڈسپلن اور نظم کے ذمہ دار مقرر کئے گئے تھے۔ ان کے پاس ذاتی حیثیت سے کوئی اتھارٹی یا اختیار نہیں تھا۔ جیسے دوسرے ایمان

لانے والے ہیں ویسے یہ ایمان لانے والے ہیں۔ ان کو اگر کوئی فوقیت یا فضیلت حاصل ہوئی تو وہ درحقیقت نبی اکرم ﷺ کی نامزدگی سے حاصل ہوئی۔ اب یہاں ضرورت پیش آئی کہ وہ پورا ڈھانچہ اور پورا نظام تشکیل پا جائے' کہ کوئی شخص کوئی اتھارٹی حاصل کر رہا ہے تو کس بنیاد پر؟ اس لئے کہ حضور ﷺ نے اس کو نامزد کیا ہے۔ اب گویا کہ ایک نظم قائم ہو رہا ہے۔ حضور ﷺ تو ابھی مکّہ میں تشریف فرما ہیں۔ مدینہ والوں سے ملاقات بھی ہوگی تو ایک سال کے بعد موسمِ حج میں ہوگی۔ یہاں مدینہ میں جو کام چلے گا اس کا کون نگران ہے' کون ذمہ دار ہے؟ کون امیر ہوگا' کون مامور ہوگا؟ کون حکم دے گا' کون سنے گا؟ کس پر اطاعت لازم ہوگی؟ یہ ہے اصل میں وہ وقت کہ جب مدینہ والوں سے آپؐ نے بیعت سمع و طاعت لے لی۔ فلسفۂ سیرت کو سمجھنے کے لئے اس تاریخی پس منظر کو اور اس تدریج کو سمجھنا ضروری ہے کہ کس طرح سے حالات کی exfoliation ہوئی ہے' کس طرح سے تقاضے ابھرے ہیں' کہاں ضرورت پیدا ہوئی ہے۔ جہاں کوئی ضرورت نہیں ہے وہاں ہمیں سیرت النبیؐ میں کوئی تکلف اور کوئی تصنع نظر نہیں آتا۔

بیعتِ عقبہ ثانیہ — نظمِ جماعت کی بیعت

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت کے حوالے سے میں نے بیعت کے جو الفاظ شروع میں سنائے یہ روایت متفق علیہ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ سند کے اعتبار سے اس سے اونچا درجہ کسی حدیث کا نہیں جو متفق علیہ ہو' جس کی صحت پر امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ دونوں کا اتفاق ہو۔ اب ہم اس حدیث کا لفظاً لفظاً مطالعہ کرتے ہیں۔ عَنْ عُبَادَةَ ابْنِ الصَّامِتِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ ''حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کی گئی ہے' اللہ اُن سے راضی ہو''۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ دونوں بیعتوں میں موجود تھے' بیعت عقبہ اُولیٰ کی روایت بھی ان سے ہے اور بیعت عقبہ ثانیہ کی روایت بھی ان سے ہے۔ کہتے ہیں: بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ ''ہم نے بیعت کی تھی رسول اللہ ﷺ سے''۔ کس بات پر بیعت کی تھی؟ کیا قول و قرار ہوا تھا؟ کیا معاہدہ ہوا تھا؟ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ

''سمع وطاعت پر''۔یعنی سنیں گے اور مانیں گے۔ جو حکم ہوگا بسر وچشم تسلیم کریں گے۔ نوٹ کر لیجئے کہ یہاں معروف کا لفظ نہیں ہے' اس لئے کہ یہ نظم جماعت کی بیعت ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر ہو رہی ہے۔ لہٰذا یہاں اس اضافی لفظ کو لانے سے جو تھوڑا سا معاملہ نرم پڑتا تھا اس سے گریز کیا گیا۔ مدینہ آ کر یہ بیعت حضور ﷺ نے پھر سب سے لی ہے' مہاجرین سے بھی لی ہے۔ ہجرت کے بعد تو پھر ایک نظم قائم ہو رہا تھا۔ چنانچہ بیعت لیتے ہوئے آنحضور ﷺ بعض اوقات ''فِی الْمَعْرُوْفِ'' یا ''فِیْ مَا اسْتَطَعْتُمْ'' کے الفاظ کا اضافہ فرما دیا کرتے تھے کہ اپنی حد استطاعت تک' اپنی امکانی حد تک اس بیعت پر قائم رہو گے۔ لیکن یہ بات نوٹ کر لیجئے کہ اس معاملے میں ''اُمّ السنۃ'' کا درجہ درحقیقت اسی حدیث کو حاصل ہے اور اس میں وہ الفاظ موجود نہیں ہیں' تاکہ بات پوری ہو' پختہ ہو' گاڑھی ہو۔ حضور ﷺ کے معاملے میں معروف کی کوئی اضافی شرط لگانے کی عقلاً یا نقلاً ضرورت ہی نہیں۔ البتہ آئندہ ہمیشہ یہ شرط موجود رہے گی۔ وہ چاہے بیعتِ حکومت ہو یا بیعت نظم جماعت۔ ''فِی الْمَعْرُوْفِ'' کی یہ شرط تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیعت کے ساتھ بھی موجود تھی' تا بہ دیگراں چہ رسد! ان سے زیادہ کس کو حق ہوگا سمع وطاعت کا؟ لیکن وہاں بھی معروف کی شرط برقرار تھی۔ اس لئے کہ اب کوئی شخص اپنی ذات میں معیار نہیں ہے' اب معیارِ مطلق اللہ اور اس کا رسولؐ ہے۔

اب آگے جو الفاظ آ رہے ہیں ان پر غور کیجئے۔ چونکہ ڈسپلن قائم کرنا ہے لہٰذا ایسے الفاظ لائے گئے ہیں جو ایک حصار قائم کر رہے ہیں اور بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں چھوڑ رہے۔ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ ''ہم سمع وطاعت پر کاربند رہیں گے چاہے مشکل ہو چاہے آسانی ہو''۔ شعوری طور پر زبان سے ایک شخص جب یہ الفاظ کہتا ہے' اور اگر واقعتاً وہ بودا انسان نہیں ہے اور سیرت وکردار کے اعتبار سے اسے دیمک نے چٹ نہیں کیا ہوا تو وہ یہ جب کہے گا خوب سوچ سمجھ کر کہے گا کہ میں حکم سنوں گا اور مانوں گا' چاہے تنگی ہو' چاہے آسانی ہو۔ عسر کا لفظ ویسے تو ہر مشکل کے لئے عام

ہے لیکن اس کا اطلاق خاص طور پر مالی تنگی پر ہوتا ہے۔ بعض احادیث میں مالی تنگی کا ذکر زیادہ آیا ہے۔ تو اس بات پر بیعت ہو رہی ہے کہ چاہے ہمارے لئے آسانیاں ہوں' فراوانیاں ہوں یا تنگیاں ہوں' ہر حالت میں ہم آپؐ کا حکم سنیں گے اور مانیں گے۔

وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ ''طبیعت کی آمادگی میں بھی اور ناگواری میں بھی''۔ منشط' نشاط سے بنا ہے۔ نشاط طبیعت کے اندر ایک آمادگی کی کیفیت ہے۔ انسان جب کسی چیز سے متفق ہوتا ہے تو اس کے لئے کام کرنے کے لئے طبیعت میں آمادگی ہوتی ہے۔ فرض کیجئے کہ کبھی کسی اجتماعی معاملے میں بہت بحث اور ردّ و قدح ہوئی ہے اور آراء کا اختلاف سامنے آیا ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ آخری فیصلہ تو ایک ہوگا' اور وہ کچھ لوگوں کی رائے کے مطابق ہوگا اور کچھ کی رائے کے خلاف ہوگا۔ اب جن کی رائے کے مطابق فیصلہ ہوا ہے انہیں تو آپ دیکھیں گے کہ بڑے چاق و چوبند ہو کر اس میں لگ رہے ہیں' اس لئے کہ وہ تو اُن کی طبیعت کا انشراح ہے' ان کی اپنی رائے یہی تھی' ان کی رائے کے مطابق فیصلہ ہوا ہے' جبکہ جن لوگوں کی رائے کے خلاف فیصلہ ہوا ہے انہیں اب اپنی طبیعت کو اس کے لئے مجبور کرنا پڑے گا۔ تو ''فِی الْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ'' کے الفاظ نے ان دونوں کیفیتوں کا گھیراؤ کر لیا ہے۔ چاہے طبیعت آمادہ ہو اور چاہے طبیعت پر جبر کرنا پڑے' اکراہ کرنا پڑے' اسے مجبور کرنا پڑے۔ اس لئے کہ نظم اس کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ جماعتی زندگی کی تو روحِ رواں یہی ہے۔ یہی اس کا لازمی تقاضا ہے۔

اگر آدمی طے کر لے کہ فیصلہ ہماری مرضی کے مطابق ہوگا تو ہم ساتھ دیں گے' ورنہ جن کی رائے کے مطابق ہوا وہ آگے بڑھیں' تو یہ جماعتی اعتبار سے منافقت ہے' جس کی سب سے نمایاں مثال غزوۂ اُحد میں سامنے آئی جب عبداللہ بن اُبی اپنے تین سو آدمیوں کے ساتھ یہ کہہ کر واپس لوٹ گیا کہ جب ہمارے مشورے پر عمل نہیں ہوتا تو ہم خواہ مخواہ اپنی جانیں خطرے میں کیوں ڈالیں؟ اس کی رائے یہ تھی کہ مدینہ کے اندر محصور ہو کر دفاع کیا جائے۔ عجیب بات ہے کہ خود حضور ﷺ کی رائے بھی اگرچہ یہی تھی' لیکن حضور ﷺ نے اپنے ساتھیوں کی رائے کا احترام کیا اور ان کی دل جوئی

کے لئے' ان کے جذبات کا پاس کرتے ہوئے' اپنی رائے پر ان کی رائے کو مقدم رکھ کر فیصلہ کر دیا۔ حضور ﷺ جب مدینہ منورہ سے نکلے تو آپؐ کے ہمراہ ایک ہزار کی نفری تھی' لیکن اس شخص نے عین میدانِ جنگ میں کتنا بڑا نقصان پہنچایا' جس سے اس وقت کتنے ہی مؤمنین صادقین کے پاؤں میں بھی ایک دفعہ تو تزلزل پیدا ہوا ہوگا کہ ایک تہائی نفری ٹوٹ کر جا رہی ہے! پہلے ہی ہم مقابلے میں ایک تہائی تھے' تین ہزار کا ایک ہزار سے مقابلہ تھا' اب ہماری ایک تہائی نفری ٹوٹ کر جا رہی ہے۔ اسی لئے سورۂ آل عمران میں الفاظ آئے ہیں: ﴿اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتَانِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا﴾ ''وہ وقت یاد کرو جب تم میں سے بھی دو گروہ ایسے تھے کہ جو ڈھیلے پڑ گئے تھے''۔ جن کے پاؤں میں تزلزل آ گیا تھا۔ عبداللہ بن اُبی کا یہ اقدام کس بنیاد پر تھا؟ ان لوگوں کا کہنا تھا: ﴿هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ﴾ ''ہمارے ہاتھ میں بھی کوئی اختیار ہے کہ نہیں؟'' اپنی من مانی کرتے ہیں' جو چاہتے ہیں فیصلہ کر دیتے ہیں' یہ معاملہ تو نہیں چل سکتا' اگر اس طرح معاملہ چلانا ہے تو پھر خود ہی جائیں' خود ہی اپنی جان و مال پر سارے خطرات برداشت کریں' ہم ساتھ نہیں دیں گے!! یہ ہے وہ چیز جس کا سدباب کیا گیا ان الفاظ میں کہ فِي الْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ چاہے ہماری طبیعت میں نشاط ہو' آمادگی ہو اور چاہے ہمیں اپنی طبیعت پر جبر کرنا پڑے۔ اگر ہم اسے خوشگوار فیصلہ محسوس کریں تب بھی حکم مانیں گے اور اگر ہماری طبیعت کے خلاف ہو' ہم اس کے لئے اپنی طبیعتوں کو آمادہ نہ پا رہے ہوں تب بھی ہم اپنی طبیعتوں کو مجبور کریں گے اور آپ کا حکم مانیں گے۔

آگے چلئے! وَعَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا ''اور اس پر بھی (ہم نے بیعت کی) کہ چاہے ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے''۔ یہ جماعتی زندگی کا تیسرا معاملہ ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک ہی امیر تو نہیں ہے' جماعتی زندگی میں تو ایک chain چلے گی۔ ایک امیر ہے' اس نے کسی کو اپنا ایک نائب مقرر کیا ہے' پھر وہ کوئی لشکر بھیج رہا ہے تو وہاں اس نے کسی کو سپہ سالار بنایا ہے۔ اس لشکر میں سپہ سالار ہی تو نہیں ہے' کوئی میمنہ کا اور کوئی میسرہ کا امیر ہے' کوئی قلب کا انچارج ہے۔ میمنہ اور میسرہ کے اندر بھی کئی گروپ ہیں' کسی کے پاس

کسی گروپ کا جھنڈا ہے' کسی کے پاس کسی کا ہے۔ تو جب بھی کوئی ہیئت اجتماعی قائم ہو گی تو اس میں یہ chain ناگزیر ہے۔ سوائے ایک شخص کے جو اُس ہیئت اجتماعی کا امیر ہے' وہ تو امیر ہی ہے' باقی تو ہر شخص امیر بھی ہے اور مامور بھی ہے۔ اپنے سے اوپر والے کا مامور ہے اور اپنے سے نیچے والوں کے لئے امیر ہے۔

اس ضمن میں ایک اعتراض یہ اٹھا دیا جاتا ہے کہ صاحبِ امارت کے انتخاب اور عزل ونصب کے کوئی قواعد وقانون ہونے چاہئیں' یہ کیا بات ہوئی کہ جس کو چاہا پسند کر لیا اور اس کو جھنڈا تھما دیا۔ اس اعتبار سے آخری امتحان جو محمد رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا لیا ہے وہ حضرت اسامہؓ کی امارت کا امتحان ہے۔ کس اعتبار سے وہ افضل تھے؟ عمر میں وہ پختہ نہیں تھے۔ کہاں ابوبکر وعمر اور عثمان وعلی رضی اللہ تعالیٰ عنہم موجود ہیں۔ کون کون موجود ہے! اور جھنڈا تھما دیا اسامہ بن زید کو۔ یہ ایک بہت بڑا امتحان تھا۔ جیسے کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ چاہے تم پر ایک حبشی غلام امیر بنا دیا جائے' تمہیں اس کا حکم ماننا ہوگا۔ یہ نہیں کہ ہم اعلیٰ ہیں' ہم برتر ہیں اور یہ کمتر ہے' اس کو ہم پر خواہ مخواہ امیر بنا دیا گیا' کوئی معیار ہونا چاہئے' کوئی قاعدہ' قانون اور ضابطہ ہونا چاہئے' یہ کیا ہے کہ بس ایک شخص پسند آ گیا اور اس کو امیر بنا دیا!! ان ساری چیزوں کا سدباب پہلے ہی سے کر دیا گیا اور محمد رسول اللہ ﷺ نے یہ بات تسلیم کروالی کہ یہ میرا اختیار ہوگا' جس کو چاہوں امیر بناؤں۔ بیعت میں ''وَعَلٰی اَثَرَةٍ عَلَیْنَا'' کے الفاظ ادا کرنے والے پہلے سے طے کر رہے ہیں' عہد کر رہے ہیں کہ چاہے دوسروں کو ہم پر ترجیح دی جائے پھر بھی ہم سمع وطاعت پر کاربند رہیں گے۔ دیکھئے یہاں اس کا بھی امکان ہے کہ آپ یہ سمجھیں کہ واقعتاً یہی شخص جس کو امیر بنایا جا رہا ہے' افضل ہے یا اہل تر ہے' لیکن ایک خیال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ ہم میں افضل نہیں ہیں۔ اس کے باوجود جس کے ہاتھ میں جھنڈا تھما دیا جائے' تمہیں اس کی اطاعت کرنی ہے۔ یہ chain جو ہے اطاعت کی' اسے برقرار رکھنا ہے۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَی اللّٰهَ)) ''جس نے میری اطاعت کی اس

نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی‘‘ ((وَمَنْ اَطَاعَ اَمِیْرِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَمَنْ عَصٰی اَمِیْرِیْ فَقَدْ عَصَانِیْ)) ’’اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی‘‘۔ اب یہ chain چلی جائے گی۔ البتہ اب معروف کی شرط آپ سے آپ آ جائے گی۔ حضور ﷺ نے بھی کسی کو معین کیا ہو تو وہاں اطاعت فی المعروف ہوگی۔

ایک صاحب کا واقعہ ملتا ہے کہ ان کو حضور ﷺ نے کسی دستے پر کمانڈر بنا کر بھیجا‘ وہ جلالی مزاج کے آدمی تھے‘ اپنے ساتھیوں سے کسی بات پر ناراض ہو گئے تو اپنا اختیار استعمال کرتے ہوئے انہیں بہت بڑا گڑھا کھودنے کا حکم دیا۔ ساتھیوں نے گڑھا کھود دیا۔ اب حکم دیا کہ اس میں لکڑیاں ڈالو۔ انہوں نے لکڑیاں ڈال دیں۔ حکم دیا کہ لکڑیوں کو آگ لگاؤ۔ انہوں نے آگ لگا دی۔ یہاں تک تو اطاعت ہو رہی ہے۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ اس آگ میں کود جاؤ! اس پر وہ ٹھٹک کر کھڑے رہ گئے کہ اسی آگ سے بچنے کے لئے تو ہم نے محمد رسول اللہ ﷺ کا دامن تھاما‘ تو اس آگ میں ہم آپ کے حکم سے کیسے کود جائیں؟ بعد میں یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ انہوں نے ٹھیک کیا‘ اور اگر کہیں وہ اس آگ میں کود جاتے تو پھر آگ ہی میں رہتے۔ یعنی جہنم میں داخل ہو جاتے۔ آپ ﷺ نے اس کی توثیق اس لئے فرمائی کہ یہ حکم فی المعروف نہیں تھا‘ یہ تو منکر کا حکم تھا‘ خودکشی کا حکم تھا۔ ایسے حکم کی اجازت کسی صاحب امر کو نہیں دی جا سکتی۔ لہٰذا چاہے وہ حضور ﷺ کا مقرر کردہ امیر ہو لیکن اس کی اطاعت بھی فی المعروف ہوگی‘ مطلق نہیں ہوگی۔ مطلق اطاعت صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے۔ محمد ﷺ آخری انسان تھے جن کی اطاعت مطلق تھی‘ ان کے بعد کسی کی اطاعت مطلق نہیں ہے۔ ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) کی اطاعت مطلق نہیں ہے تو اور کس کی ہوگی؟

یہ بھی نوٹ کیجئے کہ بعض روایات میں لفظ ’’اَمِیْرِیْ‘‘ کے بجائے ’’اَلْاَمِیْر‘‘ ہے:

((مَنْ اَطَاعَ الْاَمِیْرَ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَمَنْ عَصَی الْاَمِیْرَ فَقَدْ عَصَانِیْ)) اس لئے کہ نبی اکرم ﷺ کے بعد امارت کو ایک ادارے (institution) کی حیثیت حاصل ہونی تھی۔ اب یہ تو نہیں ہے کہ ہر ایک کو امارت کا پروانہ محمد رسول اللہ ﷺ ہی سے ملے گا' بلکہ وہ نظم کہ جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کی بجا آوری کے لئے قائم کیا جا رہا ہے' جس میں اصلاً اللہ اور اس کے رسولؐ کو مطاع مانا گیا ہے' اب اس میں جو بھی نصب امارت ہوگا اس کے ضمن میں یہ تیسری بات بھی پہلے سے مان لی گئی کہ ہم سمع وطاعت کی روش اختیار کریں گے خواہ ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے۔ اسی ''اَثَـرۃ'' سے بابِ ''اِفعال'' میں لفظ ایثار بنا ہے۔ سورۃ الحشر میں الفاظ آئے ہیں: ﴿وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِھِمْ﴾ ''وہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں''۔

آگے چوتھی بات بیان کی جا رہی ہے: وَعَلٰی اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَهٗ ''اور ہم اصحابِ امر سے جھگڑیں گے نہیں''۔ جو بھی ولاۃِ امر ہوں گے' جو جس سطح پر ہے' جس جگہ ہے' ہم اس کا حکم مانیں گے' اس سے امر میں جھگڑیں گے نہیں۔ اس کے بعد ایک روایت میں یہ اضافہ ہے: اِلَّا اَنْ تَرَوْا کُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَکُمْ فِیْهِ مِنَ اللّٰهِ بُرْھَان اور یہ الفاظ حضور ﷺ کی طرف سے ہیں کہ: ''سوائے اس کے کہ تم دیکھو (صاحبِ امر کی طرف سے) کوئی کھلم کھلا کفر جس کے بارے میں تمہارے پاس اللہ کی طرف سے کوئی دلیل موجود ہو''۔ یہ نہیں کہ ہمیں اختلاف ہے صاحب! ہم تو اس تعبیر کو تسلیم نہیں کرتے! جہاں بات تعبیروں کی یا تدبیروں کی ہوگی' جہاں مباحات کا دائرہ ہوگا وہاں آپ اختلاف نہیں کر سکتے۔ تمہارے پاس اس معاملے میں اللہ کی طرف سے کوئی دلیل قطعی ہو' کوئی ثبوت موجود ہو تب تو تم اطاعت سے سرتابی کر سکو گے' تب تم کوئی جھگڑا ڈال سکو گے' لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو معمولی اختلافات' تعبیر کے فرق یا تدبیر میں اختلافِ رائے کی بنیاد پر آپ کوئی جھگڑا پیدا کرنے کھڑے ہو جائیں تو یہ اس بیعت کے خلاف ہو جائے گا۔

بیعت کے اگلے الفاظ ہیں: وَعَلٰی اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا لَا نَخَافُ فِی

اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ ''اور (ہم نے بیعت کی تھی) اس پر بھی کہ ہم حق بات ضرور کہیں گے جہاں کہیں بھی ہوں' اور ہم اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہیں کریں گے''۔ ان الفاظ کے ذریعے عقیدت کی بنیاد پر سمع و طاعت میں غلو کا راستہ بند کر دیا گیا جس کے نتیجے کے طور پر شخصیت پرستی برآمد ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اندھے' بہرے اور گونگے بن کر چلو' بلکہ تم اپنی رائے کو برقرار رکھو۔ اپنی سوچ اور عقل کے اوپر پہرے نہ بٹھاؤ' اس کو بروئے کار لاؤ۔ اللہ نے جو استعدادات دی ہیں' ان کو بھرپور طریقے پر استعمال کرو اور تمہاری جو رائے ہو اُس کے بیان کرنے میں کبھی بھی کوئی ہچکچاہٹ' کوئی جھجک' کسی کا رعب یا کسی کی عقیدت مانع نہ آئے۔ کسی ملامت کرنے والے کے خوف سے اپنی زبانوں پر تالے مت ڈالو!

نظم اجتماعی میں اظہارِ رائے کی حیثیت

یہیں وہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ نظم اجتماعی میں اظہارِ رائے کی حیثیت کیا ہے! دراصل اظہارِ رائے یا مشورہ دینا حق نہیں ہے بلکہ فرض ہے۔ تم اپنی رائے دو' مشورہ دو' اس کے بعد تم فارغ ہو' تمہاری ذمہ داری ادا ہو گئی۔ ہمارے یہاں حقوق پر توجہ بہت زیادہ ہے' جبکہ فرائض نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اصل میں تو ایک ہی لفظ کو آپ حق بھی کہہ سکتے ہیں اور فرض بھی کہہ سکتے ہیں۔ شوہر کا جو حق بیوی پر ہے وہی بیوی کا فرض شوہر کے ضمن میں ہے۔ اسی طرح بیوی کا جو حق شوہر پر ہے وہی شوہر کا فرض بیوی کے ضمن میں ہے۔ یہ حقوق و فرائض کا معاملہ ہے۔ لیکن آج جو ہمارا معاشرہ سارا تلپٹ ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حقوق کی بات سب کرتے ہیں' فرض کی بات کوئی کرنے کو تیار نہیں۔ اگر انسان کی توجہ ذرا فرائض کی طرف منعکس ہو جائے تو تمام معاملات درست ہو جائیں۔ لہٰذا اپنے فرائض ہمیشہ پیش نظر رہنے چاہئیں۔ کوئی حق اگر مارا بھی گیا تو اللہ کے ہاں اس کی compensation ہو جائے گی' فرض کے اندر کوتاہی ہو گئی تو کیا کرو گے؟ جواب دہی تمہاری ہو گی۔ اگر فریق ثانی نے تمہارا کوئی حق مار لیا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں سارا لین دین ہو جائے گا۔ وہاں کی کرنسی نیکیاں اور بدیاں ہے'

وہاں تو اعمال کا مبادلہ ہوگا' یعنی نیکیوں اور بدیوں کا۔ لہٰذا اس میں گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ گھاٹے کا سودا اس میں ہے کہ تم نے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کی' اس کی جواب دہی اللہ کے ہاں کرنی پڑے گی۔ وہاں اپنی نیکیاں دینی پڑ جائیں گی اور ہوسکتا ہے کہ دوسروں کی غلطیوں کا وبال تمہارے اوپر آ جائے۔ تو یہاں یہ نوٹ کر لیجئے کہ اسلامی نظم جماعت میں مشورہ دینا حق نہیں ہے' فرض ہے۔ آدمی فرض ادا کر کے فارغ ہو جاتا ہے۔ اب وہ یہ نہیں کہتا کہ لازماً میری بات مانی جائے۔ اپنی بات منوانے پر اصرار تو عبداللہ بن اُبی کا طرزِ عمل ہے۔ مشورہ دینے میں کوئی inhibition پسندیدہ نہیں ہے۔ اس میں کسی کے روکنے کی وجہ سے یا کسی کے خیال اور لحاظ کی بنا پر رک جانا پسندیدہ نہیں ہے۔ تم بات کہو! کہنے کے بعد تم نے اپنا فرض ادا کر دیا' عند اللہ تم بری ہو گئے۔ اب معاملہ صاحبِ امر کا ہے۔ وہاں ووٹوں کی گنتی سے فیصلے نہیں ہوں گے۔ تنظیم کا وہ ڈھانچہ ہی مختلف ہوتا ہے جس میں کہ یہ سارا معاملہ ووٹوں کی گنتی سے وجود میں آتا ہے۔

آپ نے نوٹ کر لیا ہوگا کہ اس ایک حدیث میں اسلامی نظم جماعت کے جتنے بھی دستوری تقاضے ہیں ان کا حصر موجود ہے۔ میرے نزدیک تو یہ جوامع الکلم میں سے ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ الفاظ صحابہ کرام ؓ نے خود نہیں کہے ہوں گے' بلکہ محمد رسول اللہ ﷺ نے تلقین فرمائے اور ان میں حضور ﷺ نے نظم اور ڈسپلن کے اعتبار سے بیعت کرنے والوں کا اس طرح ''گھیراؤ'' کیا ہے کہ کہیں کوئی رخنہ باقی نہیں چھوڑا۔ معاذ اللہ' آپؐ کی کوئی ذاتی غرض نہیں تھی۔ دین کا کام کرنا ہے تو اس کے لئے ایک مضبوط نظم والی جماعت چاہئے' ڈھیلا ڈھالا ادارہ نہیں چاہئے۔

نظمِ اجتماعی کا شعور اور صحابہ کرامؓ

صحابہ کرام ؓ کے اندر اس نظم کا شعور اِس قدر پیدا ہو چکا تھا کہ ہر شخص ہر وقت یہ نوٹ کرتا کہ اس وقت میں کس حیثیت میں ہوں اور دوسرا شخص کس حیثیت میں ہے۔ آیا ہم ہم مرتبہ (equi-status) ہیں اور کوئی تیسرا ہمارا امیر ہے' ہم دونوں اس کے تابع ہیں یا یہ کہ میں امیر ہوں اور یہ مامور ہے' یا یہ کہ وہ امیر ہے' میں مامور ہوں۔ نظم

کے اعتبار سے یہ تین مختلف حیثیتیں ہیں' اور ایک انسان ہر معاملے میں' جو بھی اقدام وہ کر رہا ہے یا زبان سے جو بھی لفظ نکال رہا ہے' اس کا رویہ اگر اس شعور کے تحت نہیں ہو گا تو سارا نظم تہہ و بالا ہو جائے گا۔ ایک نظم جماعت کے ساتھی ہونے کے اعتبار سے یقیناً سب برابر ہیں' لیکن جب امر قائم ہوا ہے' صاحب امر کا نصب ہو گیا ہے' اب وہ امیر ہے اور آپ مامور ہیں۔ جیسے انسان ہونے کے ناتے مَرد و زن یقیناً برابر ہیں۔ شرفِ انسانیت کے اعتبار سے عورت گھٹیا نہیں ہے' لیکن جب ایک مَرد اور ایک عورت کے اندر رشتۂ ازدواج قائم ہوا ہے تو ان کے مابین محض مَرد اور عورت کی نسبت نہیں رہی' اب شوہر اور بیوی کی نسبت ہے۔ یہاں قرآنی ہدایت ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ﴾ کا اطلاق ہو گا۔ اب معاملہ بالکل بدل گیا' نوعیت تبدیل ہو گئی' نسبت اور ہو گئی! اسی طرح تمام رفقاء آپس میں برابر ہیں' لیکن جب کوئی صاحب امیر بنا دیئے گئے تو اب امیر اور مامور کی جو ایک نسبت قائم ہو جاتی ہے اس کا تعین ہونا چاہئے۔ چنانچہ اس کی نمایاں ترین مثال جب پہلی مرتبہ میرے سامنے آئی تو عقل دنگ رہ گئی کہ حضور ﷺ نے ڈسپلن کا کیسا شعور پیدا کیا تھا!

مشہور واقعہ ہے کہ سن ۹ ھ میں حضور ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر الحج بنا کر قافلہ روانہ فرما دیا۔ قافلہ روانہ ہو چکا تھا کہ سورۃ التوبۃ کی ابتدائی چھ آیات نازل ہوئیں' جن میں تیسری آیت کے الفاظ یہ ہیں: ﴿وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ﴾ یعنی حج اکبر کے دن اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے یہ باتیں لوگوں کے سامنے بیان کر دی جائیں' ان کا اعلان (proclamation) ہو جائے۔ تو حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ تم میرے نمائندے کی حیثیت سے اجتماعِ حج میں یہ آیات پڑھ کر سنا دو! اس لئے کہ یہ ایک انتہائی اہم اعلان تھا کہ مشرکین سے تمام معاہدے ختم ہو جائیں گے' کسی کا کوئی عہد نہیں رہے گا اور یہ بات کہ چار مہینے ختم ہوئے تو قتل عام بھی شروع ہو جائے گا۔ اصل میں مسلمان تو اپنے نظم کو جانتے تھے' لیکن ابھی جو لوگ دائرۂ اسلام سے باہر تھے وہ اس سے واقف نہیں تھے۔ وہ

اپنی سابقہ روایت کے مطابق یہ سمجھ سکتے تھے کہ یہ اعلان اسی صورت میں مؤثر (valid) ہے جبکہ حضور ﷺ کا کوئی انتہائی قریبی رشتہ دار' اُن کے گھرانے کا کوئی فرد یہ اعلان کرے۔ تو گویا اپنے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے حضور ﷺ نے حضرت علی ؓ کو بھیج دیا اور ان کے ذمے لگایا کہ اجتماعِ حج میں ان آیات کو پڑھ کر سنا دیں۔ جب حضرت علیؓ آئے تو حضرت ابوبکرؓ نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا اور ان سے پہلا سوال یہ کیا کہ ''اَمِیْرٌ اَوْمَاْمُوْرٌ ؟'' یعنی مجھے پہلے یہ بتا دیجئے کہ آپ امیر کی حیثیت سے آئے ہیں یا مامور کی حیثیت سے؟ مجھے اپنی حیثیت بھی معلوم ہونی چاہئے اور آپ کی حیثیت بھی۔ اگر حضور ﷺ نے مجھے معزول کر کے آپ کو امیر بنایا ہے تو میں حاضر ہوں' امارت سنبھالئے! اور اگر ایسا نہیں ہے تو بھی مجھے معلوم ہونا چاہئے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: ''مَاْمُوْرٌ!'' یعنی میں امیر بنا کر نہیں بھیجا گیا' امیر آپ ہی ہیں' میں مامور بنا کر بھیجا گیا ہوں' صرف ایک خاص کام میرے ذمے لگایا گیا ہے' وہ میں کروں گا۔ یہ ہے اس نظم اور ڈسپلن کا احساس!

اس نظم وضبط کو میں انقلاب کے معاملے میں مثال کے طور پر پیش کیا کرتا ہوں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے برپا کردہ انقلاب میں یہ پہلو مثالی حیثیت کا حامل ہے۔ جس معاشرے میں کوئی نظم اور کوئی ڈسپلن نہیں تھا' جسے ''قَوْمًا لُّدًّا'' (جھگڑالو قوم) کہا گیا ہے' اس میں کون کسی کی بات سنتا تھا اور کون کسی کے سامنے سر جھکانے کو تیار ہوتا تھا۔ اس قوم میں ڈسپلن کا یہ احساس پیدا کیا! اسی کا مظہر تھا کہ حضرت ابوعبیدہ ؓ کو حضرت خالد ؓ کی جگہ پر کمانڈر مقرر کیا گیا تو حضرت خالد ؓ نے یہ نہیں کہا کہ اچھا جی' اب مجھے رخصت دیجئے' جو شخص میرے ماتحت رہا ہے میں اس کے ماتحت رہ کر اب کیسے کام کروں گا! اس لئے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے جو تربیت کی تھی اس کا نتیجہ تھا کہ ہر ایک کے پیش نظر یہی تھا کہ مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے' خواہ امیر کی حیثیت سے ہو خواہ مامور کی حیثیت سے۔ جس کو جو حکم ملا ہے اس کو وہ کام کرنا ہے' ہم اپنے فرض کی ادائیگی کے لئے حاضر ہوئے ہیں' کسی پر احسان رکھنے کے لئے نہیں آئے۔ یہ ساری جدوجہد ہم اپنی

عاقبت بنانے کے لئے کر رہے ہیں' ہم کسی اور کا جھنڈا تھامنے کے لئے نہیں آئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اپنی عاقبت بنانے کے لئے دین کو قائم کرنا ہماری ذمہ داری ہے اور اس کے لئے جدوجہد کرنا فرض ہے۔ اس فرض کی ادائیگی کے لئے اجتماعیت لازم ہے اور جماعتی حیثیت کے بغیر یہ کام ہو نہیں سکتا۔ اس کے لئے ایک ڈسپلن ہوگا' جس میں امراء کی اور مامورین کی ایک chain ہوگی۔ ظاہر بات ہے کہ جب امیر اور مامور کی یہ نسبت قائم ہوگی تو اس نسبت کا پھر جو بھی تقاضا ہوگا وہ پورا کیا جائے گا۔ لیکن سمع و طاعت کا یہ معاملہ شخصی نہیں ہوگا' بلکہ اس نظم کے اعتبار سے کسی شخص کی جو حیثیت ہے اسی درجے میں اس کی اطاعت ہو رہی ہے۔ یہ ہے وہ نظم جماعت جو آنحضور ﷺ نے قائم کر کے دکھایا اور یہ ہے وہ بیعت کا نظام جو منصوص بھی ہے' مسنون بھی ہے اور ماثور بھی۔

یہاں یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ رسول اللہ ﷺ مختلف مواقع پر اور بھی بیعتیں لے لیتے تھے۔ مثلاً کسی سے بیعت لی: ''عَلٰی نُصْحٍ لِکُلِّ مُسْلِمٍ''۔ یعنی اس بات پر کہ ہر مسلمان کی خیر خواہی کرو گے۔ اسی طرح آپؐ نے کہیں ہجرت کی بیعت' کہیں جہاد کی بیعت اور کہیں موت کی بیعت لی۔ کہیں یہ بیعت بھی لی کہ میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار نہیں کریں گے (عَلٰی اَنْ لَّا نَفِرَّ) تو حضور ﷺ کے زمانے میں یہ بیعتیں ہوئی ہیں۔ لیکن یہ جان لیجئے کہ اصل بیعتیں دو ہیں: ایک بیعت اسلام اور اس کے ساتھ بیعت ارشاد' اور دوسری بیعت جہاد اور بیعت سمع و طاعت۔ اس لئے کہ اس اجتماعیت کے لئے بیعت سمع و طاعت حضرت عبیدہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث سے ثابت ہے جس کا ابھی ہم نے مطالعہ کیا۔ نظم اجتماعی کے ضمن میں اس حدیث کو اصل ''منات'' کی حیثیت حاصل ہے۔ یعنی یہ وہ کھونٹا ہے جس کے گرد اجتماعیت کی چکی گھومتی ہے۔ اس حدیث کا تو ایک ایک لفظ ہم میں سے ہر شخص کو زبانی یاد ہونا چاہئے اور ان تقاضوں کا پورا شعور ہونا چاہئے' اس لئے کہ ہمیں اب اپنی اجتماعیت ہیئت کو بالکلیہ اس پوری حدیث کے سانچے میں ڈھالنا ہے اور اب بالکلیہ اسی بیعت کے نظام پر اپنے پورے ڈسپلن کو اور اپنے پورے ڈھانچے کو کھڑا کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی

توفیق عطا فرمائے۔

آج کے اس درس کو میں اس شعر پر ختم کر رہا ہوں جو متفق علیہ روایات کے مطابق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم غزوۂ احزاب کے موقع پر خندق کھودتے ہوئے پڑھ رہے تھے:

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدًا
عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا

''ہم ہیں وہ لوگ جنہوں نے محمد ﷺ سے جہاد کی بیعت کی۔ اب یہ جہاد جاری رہے گا جب تک ہمارے جسم و جان کا رشتہ برقرار ہے''۔

بارك الله لی ولكم فی القرآن العظيم ونفعنی واياكم بالايات والذكر الحكيم

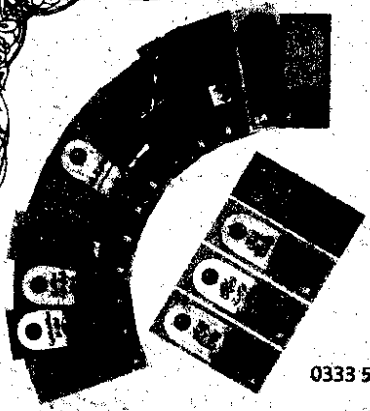

- مستند علماء کی منتخب تحریریں سے مزین،
- فرقہ وارانہ تعصبات سے پاک،
- دینی شعور بیدار کرنے کے لیے نہایت موثر،
- پُراثر تحریریں، دیدہ زیب پمفلٹس کی صورت میں انتہائی مناسب قیمت پر۔
- خود پڑھیے، دوسروں کو پڑھائیے یہ صدقہ جاریہ ہے۔
- آپ کا یہ تحفہ کسی کی زندگی بدل سکتا ہے۔

مکان نمبر ZB-1037/C، سیکٹر 3،
خیابان سرسید راولپنڈی، فون موبائل 0333 5115922

مندرجہ ذیل موضوعات دستیاب ہیں۔

(۱) فکر آخرت (۲) ہدایت کا اصل دین (۳) جنت النعیم (۴) وقنا عذاب النار (۵) مبارک ہو (۶) قرآن حکیم سے فائدہ اٹھانے کی پانچ شرائط (۷) فضائل قرآن (۸) قرآن کا مطلوب انسان (۹) زبان کی حفاظت (۱۰) مسلمانوں پر قرآن کے حقوق (۱۱) مطالعہ فطرت اور ایمان (۱۲) محاسبہ نفس (۱۳) فضائل ذکر (۱۴) انفاق فی سبیل اللہ (۱۵) حضرت محمد ﷺ قدیم صحیفوں میں (۱۶) قرآن حکیم ایک لازوال معجزہ۔

بطور نمونہ طلب کرنے کیلئے دس روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کیجئے۔

مسلمان کا طرزِ حیات (۳۳)

علامہ ابوبکر جابر الجزائری کی شہرۂ آفاق کتاب

"مِنهاجُ المسلم" کا اردو ترجمہ

مترجم: مولانا عطاء اللہ ساجد

کتاب الاخلاق

تیسرا باب

توکّل اور خود اعتمادی

مسلمان تمام اعمال میں اللہ پر توکّل رکھنا صرف اخلاقی فریضہ ہی نہیں سمجھتا بلکہ وہ اسے دینی فریضہ کا مقام دیتا ہے اور اسے اسلامی عقائد میں شمار کرتا ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں اس کا حکم دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (المائدۃ:۲۳)

''اور اگر تم مؤمن ہو تو اللہ ہی پر بھروسہ رکھو۔''

نیز ارشاد ہے:

﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (التغابن:۱۳)

''اور مؤمنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔''

اس لئے اللہ تعالیٰ پر کامل توکل مؤمن کے ایمان کا جزو ہے۔

ایک مسلم جب اللہ تعالیٰ پر کاملاً توکل کرتے ہوئے' اس کے لئے مکمل طور پر خود سپردگی کا اظہار کر کے اللہ تعالیٰ کی عبودیت کا حق ادا کرتا ہے تو اس کے دل میں توکل کا وہ غلط مفہوم بالکل نہیں ہوتا جو اسلام سے ناواقف لوگ یا عقیدۂ اسلام کے مخالفین سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ توکل تو صرف ایک لفظ ہے جو زبان سے ادا کر دیا جاتا ہے' دل میں اس کا کوئی خاص مطلب موجود نہیں ہوتا' اور عقل اس سے کوئی خاص مفہوم مراد نہیں

لیتی۔ بعض لوگوں نے توکل کا یہ مطلب سمجھ رکھا ہے کہ ظاہری اسباب سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار کی جائے اور پستی پر قناعت کر کے سمجھ لیا جائے کہ یہ توکل اور رضا بالقضاء پر عمل ہو رہا ہے۔ نہیں نہیں! وہ توکل جو مسلمان کے ایمان اور عقیدہ کا جزو ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کے احکام کی اس انداز سے تعمیل کا نام ہے کہ وہ جس کام کو کرنا چاہتا ہے اس کے تمام مطلوبہ اسباب مہیا کرے۔ وہ بغیر اسباب حاضر کئے ثمر کی امید نہ لگائے رہے اور بغیر مقدمات کے نتیجہ کا امیدوار نہ ہو۔ البتہ ان اسباب کے ثمر آور ہونے اور ان مقدمات کے بارآور ہونے کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دے۔ کیونکہ اس چیز کی قدرت محض اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ مسلمان کے نزدیک توکل عمل اور امید دونوں کے مجموعے کا نام ہے' جس کے ساتھ قلبی اطمینان اور سکون پایا جاتا ہے اور یہ پختہ یقین بھی کہ ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہے' جو کچھ اللہ نہ چاہے وہ وجود میں نہیں آ سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ اچھے عمل کرنے والے کا اجر ضائع نہیں فرماتا۔ مسلمان یہ تسلیم کرتا ہے کہ کائنات میں اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین فطرت کارفرما ہیں' لہٰذا وہ کوئی کام کرنے سے پہلے پوری توجہ اور کوشش سے مطلوبہ اسباب مہیا کر لیتا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھتا کہ محض اسباب کے ذریعے اس کی کوشش کامیاب ہو سکتی ہے اور مقصود حاصل ہو سکتا ہے' بلکہ وہ ان اسباب کو محض اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کے طور پر مہیا کرتا ہے۔ باقی رہا نتائج کا حصول اور مقاصد تک رسائی' تو مؤمن ان کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیتا ہے' کیونکہ یہ سب کچھ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ جو کچھ چاہے وہی دیتا ہے اور اس کی مشیت کے بغیر کوئی کام انجام تک نہیں پہنچ سکتا۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی محنت کرتا ہے' لیکن اپنی مشقت اور جدوجہد کا پھل کھانا اسے نصیب نہیں ہوتا اور ایک شخص بیج بوتا ہے لیکن اس کی پیداوار اسے حاصل نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ اسباب کے متعلق ایک مؤمن کا نظریہ کچھ یوں ہوتا کہ وہ صرف اسباب پر اعتماد اور مقصود کے حصول کے لئے انہی کو سب کچھ سمجھ لینے کو شرک قرار دیتا ہے اور اس سے بچتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مطلوبہ اسباب کو ترک کر دینا اور ان کے حصول پر

قدرت رکھتے ہوئے بھی انہیں استعمال نہ کرنا' اس کی نظر میں معصیت اور حرام ہوتا ہے' لہٰذا وہ اس روش سے بھی بچتا ہے اور اللہ سے اپنے قصور کی معافی کا طلب گار رہتا ہے۔

اسباب کے متعلق مسلمان کا یہ نقطۂ نظر اس کے اسلام کی روح سے ماخوذ ہے اور اس کی بنیاد نبی مقدس جناب محمد ﷺ کی تعلیماتِ مبارکہ پر ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اللہ کی راہ میں بہت سی جنگیں لڑیں۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ممکن حد تک اسباب اور ہتھیار جمع کئے بغیر آپ معرکۂ کارزار میں گھس گئے ہوں' بلکہ آنحضرت ﷺ جنگ کے لئے مناسب وقت اور مناسب جگہ کا انتخاب بھی بڑی توجہ اور احتیاط سے فرماتے تھے۔ گرمی کے موسم میں آنحضرت ﷺ اس وقت دشمن پر حملہ کرتے تھے جبکہ دن کے آخری حصہ میں ہوا ٹھنڈی ہو چکی ہو اور دوپہر کی شدید گرمی کا اثر مناسب حد تک زائل ہو چکا ہو۔ اور حملہ کرنے سے پہلے آپؐ باقاعدہ سوچ سمجھ کر پروگرام ترتیب دیتے اور مجاہدین کی صفوں کو مرتب فرماتے تھے۔ پھر جب آپؐ ان تمام مادی اسباب کے حصول سے فارغ ہو جاتے جو کوئی جنگ جیتنے کے لئے ضروری ہیں' تو پھر آپؐ اپنے ربّ کے حضور ہاتھ پھیلا کر دعا کرنا شروع کر دیتے:

((اَللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتَابِ وَمُجْرِيَ السَّحَابِ وَهَازِمَ الْاَحْزَابِ اُهْزِمْهُمْ وَانْصُرْنَا عَلَيْهِمْ)) (۱)

''اے اللہ! اے کتاب نازل کرنے والے! اے بادلوں کو (ایک جگہ سے) چلا کر (دوسری جگہ) لے جانے والے! اے لشکروں کو شکست دینے والے! ان (کافروں) کو شکست دے' اور ان کے خلاف ہماری مدد فرما۔''

یعنی آنحضرت ﷺ کا اُسوۂ مبارک یہ ہے کہ تمام مادّی اور روحانی اسباب جمع فرماتے' پھر اس کام کی کامیابی کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیتے' اور اللہ تعالیٰ کی مشیت و رحمت پر امید رکھتے۔

---

۱) صحیح البخاری' کتاب الجهاد' باب کان النبی ﷺ اذا لم یقاتل اول النهار اخر القتال حتی تزول الشمس۔ وصحیح مسلم' کتاب الجهاد' باب استحباب الدعاء بالنصر عند لقاء العدو۔

ایک اور مثال دیکھئے۔ آنحضرت ﷺ کے اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپؐ کی اجازت سے مکہ چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت کر چکے تھے' لیکن آنحضور ﷺ خود اللہ کے حکم کے انتظار میں رُکے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کو بھی ہجرت کی اجازت مل گئی۔ اس وقت آنحضرت ﷺ نے سفر ہجرت کے سلسلہ میں کیا اقدامات کئے؟

۱) مدینہ منورہ تک سفر میں ساتھ دینے کے لئے بہترین ہم سفر منتخب فرمایا' یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔

۲) سفر کے دوران استعمال کے لئے کھانے اور پانی کا بندوبست فرمایا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صاحب زادی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے کھانا تیار کر کے پوٹلی میں باندھا۔ اور اسے باندھنے کے لئے اپنی کمر کے پٹکے میں سے ایک حصہ پھاڑ کر استعمال کیا۔ اسی وجہ سے ان کا لقب ''ذات النطاقین'' (دو کمر بندوں والی) مشہور ہوا۔

۳) اس طویل دشوار گزار سفر میں سواری کے لئے بہترین اونٹنی کا بندوبست کیا۔

۴) ایک ایسے شخص کو ساتھ لیا جو مختلف راستوں اور گھاٹیوں سے بہت اچھی طرح واقف تھا اور اس نے اس دشوار گزار سفر میں راہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔

۵) جب آپؐ روانہ ہونا چاہتے تھے تو دشمنوں نے ہر طرف سے گھر کا محاصرہ کیا ہوا تھا تاکہ آنحضور ﷺ ان کے ہاتھ سے بچ کر نہ نکل سکیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے دشمن کو دھوکے میں رکھنے کے لئے اپنے چچازاد بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ حضور ﷺ کے بستر پر سو جائیں۔ اس طرح آپؐ کے نکل جانے کے بعد بھی دشمن دروازے کے شگافوں سے جھانک کر یہی سمجھتے رہے کہ حضور علیہ السلام ابھی آرام فرما رہے ہیں۔ اس لئے وہ لوگ حضور علیہ السلام کے بیدار ہونے کا انتظار کرتے رہے۔

۶) جب مشرکین نے حضور علیہ السلام اور آپؐ کے ساتھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تلاش میں بھاگ دوڑ شروع کی تو آنحضرت ﷺ غارِ ثور میں تشریف لے گئے تاکہ اپنے

دشمنوں کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں جو غصہ سے دیوانے ہو کر آپؐ کی تلاش میں سرگرداں تھے۔

۷) پھر جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: حضور! اگر ان میں سے کسی نے اپنے پیروں کی طرف نگاہ کی تو ہم اسے نظر آ جائیں گے، تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَا ظَنُّکَ یَا اَبَابَکْرٍ بِاثْنَیْنِ اللّٰہُ ثَالِثُھُمَا)) (۲)

''ابوبکر! ان دو افراد کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے جن کے ساتھ تیسرا اللہ ہے؟''

اس واقعہ سے ایمان اور توکل کے حقائق کھل کر سامنے آ جاتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جنابِ رسولِ مکرم ﷺ نے نہ اسباب کا انکار کیا، نہ اسباب پر کلی اعتماد رکھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمن کا آخری سبب اور وسیلہ یہی ہوتا ہے کہ وہ خود کو اللہ تعالیٰ کے قدموں میں ڈال دے اور پورے اطمینان وسکون سے اپنے معاملات اس کے ہاتھ میں دے دے۔ رسول اللہ ﷺ نے کافروں کے شر سے بچنے کے لئے تمام ممکن وسائل استعمال کر لئے، حتیٰ کہ ایک تاریک غار میں، جو سانپوں اور بچھوؤں کا مسکن بھی ہو سکتا ہے، پناہ لے لی۔ اُس وقت جب آپؐ کے ہم سفر کے دل میں خوف کے آثار ظاہر ہوئے تو حضور علیہ السلام نے ایمان وتوکل سے بھرپور اعتماد اور یقین سے ارشاد فرمایا:

((لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا ' مَا ظَنُّکَ یَا اَبَابَکْرٍ بِاثْنَیْنِ اللّٰہُ ثَالِثُھُمَا)) (۳)

''غم نہ کر! یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ ابوبکر! ان دو افراد کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے جن کے ساتھ تیسرا اللہ ہے۔''

ایک مسلمان کا اسباب کے متعلق جو نظریہ ہونا چاہئے وہ نبی اکرم ﷺ کے اس عملی نمونہ سے واضح ہے۔ اور مؤمن اپنے لئے نئی نئی راہیں تلاش نہیں کیا کرتا، وہ تو اسوۂ نبویؐ کی اقتداء اور پیروی کیا کرتا ہے!

ایک مؤمن کی نظر میں ''خود اعتمادی'' کا وہ مطلب نہیں ہوتا جو گناہوں کی وجہ سے حجابوں میں گرفتار ہو جانے والے سمجھتے ہیں کہ خود اعتمادی کا مطلب اللہ تعالیٰ سے

۲) صحیح البخاری، کتاب فضائل الصحابۃ، باب مناقب المھاجرین وفضلھم۔

۳) صحیح البخاری، کتاب فضائل الصحابۃ، باب مناقب المھاجرین وفضلھم۔

اپنے تعلقات توڑ لینا ہے اور یہ کہ بندہ خود اپنے اعمال کا خالق اور اپنے نفع ونقصان کا مالک ہے اور اِس معاملہ میں اللہ تعالیٰ کا کوئی عمل دخل نہیں۔ یہ تصور بالکل غلط اور راہِ حق سے دُور ہے۔

ایک مسلمان جب یہ کہتا ہے کہ کسب وعمل میں اپنے آپ پر اعتماد کرنا ضروری ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی کے سامنے اپنی حاجت پیش نہیں کرتا' اپنے آپ کو اس کے سوا کسی کا محتاج نہیں سمجھتا۔ جس کام کو وہ خود انجام دے سکتا ہے اس میں اللہ کے سوا کسی سے مدد نہیں مانگتا تاکہ دل کا تعلق ماسوی اللہ سے نہ ہو جائے۔ کیونکہ اللہ کے سوا کسی اور سے خوف ورجا کا تعلق ایک مؤمن کے لئے قابل قبول نہیں۔

مذکورہ بالا اخلاق واوصاف میں ایک مسلمان کے پیش نظر سلف صالحین اور صدیقین کا اسوۂ حسنہ ہوتا ہے جن کی یہ کیفیت تھی کہ اگر وہ گھوڑے پر سوار ہوں اور کوڑا ہاتھ سے گر جائے تو کسی سے نہیں کہتے تھے کہ کوڑا پکڑا دیں' بلکہ خود گھوڑے سے اتر کر کوڑا اٹھاتے تھے۔(۴)

خود رسول اللہ ﷺ بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی اور اللہ کے سوا کسی سے اپنی حاجت طلب نہ کرنے کی شروط پر بیعت لیتے تھے۔(۵)

مسلمان اللہ پر توکل اور خود اعتمادی کے اس عقیدہ پر کاربند رہ کر زندگی گزارتا ہے۔ اور اس پر قائم رہنے کے لئے وہ ان آیاتِ مبارکہ اور احادیثِ مقدسہ کو فراموش نہیں ہونے دیتا جن سے اس نے یہ عقیدہ اور اخلاقِ حسنہ کا سبق لیا ہے۔ مثلاً ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ .....﴾ (الفرقان:۵۸)

''اور اس (اللہ) پر توکل کیجئے جسے موت نہیں آتی۔''

اور ارشاد ہے:

﴿وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ﴾ (آل عمران:۱۷۳)

---

٤) صحيح مسلم' كتاب الزكاة' باب النهى عن المسالة۔

٥) صحيح مسلم' كتاب الزكاة' باب النهى عن المسالة۔

''اور مؤمنوں نے کہا: ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔''

نیز فرمانِ الٰہی ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ﴾ (آل عمران:۱۵۹)

''اللہ تعالیٰ یقیناً توکل کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔''

اور ارشادِ نبویؐ ہے:

((لَوْ اَنَّكُمْ تَتَوَكَّلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ حَقَّ تَوَكُّلِهٖ لَرَزَقَكُمْ كَمَا يُرْزَقُ الطَّيْرُ، تَغْدُوْ خِمَاصًا وَتَرُوْحُ بِطَانًا))

''اگر تم اللہ پر کما حقہ توکل کرو تو تمہیں اس طرح رزق ملے جس طرح پرندوں کو ملتا ہے۔ صبح بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر آتے ہیں۔''(۶)

نیز آنحضرت ﷺ جب گھر سے باہر تشریف لاتے تھے تو فرماتے تھے:

((بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ)) (۷)

''اللہ کے نام سے (باہر نکلتا ہوں) اور میں نے اللہ پر توکل کیا ہے۔ اور اللہ (کی توفیق) کے بغیر نہ (برائی اور تکلیف سے) بچاؤ ممکن ہے نہ (نیکی اور دُنیوی فائدہ کی) طاقت۔''

ایک بار آنحضرت ﷺ نے بتایا کہ ستر ہزار افراد بغیر حساب کتاب کے اور بغیر کوئی سزا بھگتنے کے جنت میں داخل ہوں گے۔ جب صحابہ کرام ؓ نے ان کے متعلق دریافت کیا تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((هُمُ الَّذِيْنَ لَا يَسْتَرْقُوْنَ وَلَا يَكْتَوُوْنَ وَلَا يَتَطَيَّرُوْنَ وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ)) (۸)

''یہ وہ لوگ ہیں جو دَم نہیں کرواتے' (کسی بیماری کے علاج کے لئے اپنے جسم پر آگ سے) داغ نہیں لگواتے' بدشگونی نہیں کرتے' اور صرف اپنے ربّ پر توکل کرتے ہیں۔''

---

۶) جامع الترمذی' کتاب الزهد' باب فی التوکل علی اللّٰه۔ وسنن ابن ماجه' کتاب الزهد' باب التوکل والیقین۔

۷) جامع الترمذی' کتاب الدعوات' باب ما یقول اذا خرج من بیته۔

۸) صحیح البخاری' کتاب الرقاق' باب یدخل الجنة سبعون الفاً بغیر حساب۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب الدلیل علی دخول طوائف من المسلمین الجنة بغیر حساب ولا عذاب۔

کتاب الاخلاق

چوتھا باب

ایثار

مسلمان اپنے دین کی روشن تعلیمات سے جو اعلیٰ اخلاق سیکھتا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دوسرے انسان سے اتنی محبت پیدا ہو کہ اپنی ضرورت پر اس کی ضرورت کو پورا کرنے کو ترجیح دی جائے۔ مسلمان کو جہاں بھی ایثار کا موقع ملتا ہے' وہ دوسرے کو خود پر ترجیح دیتا ہے' دوسروں کا پیٹ بھرنے کے لئے خود بھوک برداشت کر لیتا ہے اور دوسرے کی پیاس بجھانے کے لئے خود پیاسا رہنا پسند کر لیتا ہے' بلکہ وہ دوسروں کی زندگی کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی جان بھی قربان کر دیتا ہے۔ جس مسلمان کی روح صفاتِ کمال سے مزین ہو چکی ہو' جس کے دل میں نیکی کی محبت گھر کر چکی ہو' وہ ان فضائل کے حصول کے لئے اگر اتنے بلند مقام تک پہنچ جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہی تو وہ ''اللہ کا رنگ'' ہے جو کسی مسلمان پر پوری طرح چڑھ جائے تو تمام رنگ اس کے سامنے ہیچ ہو جاتے ہیں۔

مسلمان جب نیکی سے محبت رکھتے ہوئے جذبۂ ایثار پر عمل پیرا ہوتا ہے تو وہ ان سلف صالحین کے نقش قدم پر چل رہا ہوتا ہے جن کی تعریف اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں فرمائی ہے:

﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (الحشر:۹)

''اور وہ (دوسروں کو) اپنی جانوں پر ترجیح دیتے ہیں اگر چہ وہ خود فاقہ کا شکار ہوں۔ اور جسے نفس کے بخل سے بچا لیا گیا تو ایسے لوگ ہی فلاح پانے والے ہوتے ہیں۔''

مسلمان کے تمام اعلیٰ اخلاق اور اچھی عادات کا منبع و مصدر رحمتِ خداوندی کا فیضان اور حکمتِ محمدیؐ کا چشمۂ فیض ہے۔ مسلمان کے اخلاق کی بلندی اور رفعت اس قسم کے

فرامین نبویہ ؐ کی مرہونِ منت ہے کہ:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْهِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِهٖ)) (۱)

''تم میں سے کوئی مؤمن نہیں بن سکتا جب تک اپنے بھائی کے لئے بھی وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔''

اور ﴿وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ﴾ جیسی آیاتِ مبارکہ کی وجہ سے مؤمن میں نیکی کی محبت اور ایثار کی رغبت ترقی کرتی ہے۔

مسلمان کی زندگی تعلق باللہ کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس کی زبان اللہ کی یاد سے تر رہتی ہے اور دل اس کی محبت میں مگن۔ جب وہ اللہ کی پیدا کی ہوئی کائنات میں نظر دوڑاتا ہے تو عبرت حاصل کرتا ہے اور جب قرآن کی مندرجہ ذیل آیات پڑھتا ہے تو اس کی نظر میں دنیا حقیر ہو جاتی ہے اور وہ دنیا کو چھوڑ کر آخرت کو پسند کر لیتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَیْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا﴾ (المزمل: ۲۰)

''اور تم جو بھلائی اپنے لئے آگے بھیجو گے اسے اللہ کے ہاں اس سے بہتر حالت میں اور عظیم تر ثواب والی پاؤ گے۔''

نیز ارشاد ہے:

﴿وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً یَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ۝ لِیُوَفِّیَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَیَزِیْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ۝﴾ (فاطر: ۲۹، ۳۰)

''اور ہم نے انہیں جو کچھ دیا ہے وہ اس میں سے پوشیدہ طور پر بھی خرچ کرتے ہیں اور ظاہراً بھی۔ انہیں اس تجارت سے امیدیں ہیں جو کبھی کساد بازاری کا شکار نہیں ہوگی۔ نتیجہ یہ ہے کہ اللہ انہیں ان کے اجر و ثواب پورے پورے عنایت فرمائے گا اور اپنے فضل سے مزید بھی (بہت کچھ) دے گا۔ وہ واقعی

---

۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان ان یحب لاخیه ما یحب لنفسه۔ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل ان من خصال الایمان ان یحب لاخیه المسلم ما یحب لنفسه من الخیر۔

بخشنے والا اور قدر کرنے والا ہے۔''

اور جس شخص کی کیفیت یہ ہو وہ کیوں نہ اپنا مال پوری سخاوت سے خرچ کر دے گا؟ وہ کیوں خیر کو پسند نہ کرے گا؟ حالانکہ اسے علم ہے کہ آج وہ جو کچھ اللہ کی راہ میں پیش کرے گا کل قیامت کو وہ اسے بہتر حالت میں واپس مل جائے گا اور اسے اس کا عظیم ثواب بھی ملے گا۔

آئندہ سطور میں قارئین کی خدمت میں چند ایسے واقعات پیش کئے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ سلف صالحین کس طرح ایثار و سخاوت پر عمل پیرا تھے۔

(۱) قریش کی پارلیمنٹ دار الندوہ نے ابوجہل (لعنۃ اللہ علیہ) کی پیش کردہ قرارداد بالاتفاق منظور کر لی کہ نبی کریم ﷺ کو ان کے گھر میں (نعوذ باللہ) شہید کر دیا جائے۔ جناب رسول اللہ ﷺ کو اس ظالمانہ فیصلہ کی اطلاع ہوگئی۔ آنحضرت ﷺ کو ہجرت کی اجازت تو مل ہی چکی تھی، چنانچہ آپؐ نے ہجرت کا ارادہ فرما لیا۔ آپؐ نے چاہا کہ کوئی شخص رات کو آپؐ کے بستر پر سو جائے تا کہ آپؐ کو پکڑنے کا ارادہ رکھنے والے دھوکہ کھا جائیں اور حضور ﷺ انہیں انتظار کرتے چھوڑ کر نکل جائیں۔ آپؐ نے محسوس فرمایا کہ آپؐ کے چچازاد علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اس قربانی کے اہل ہو سکتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے معاملہ ان کے سامنے رکھا۔ انہوں نے بلاتوقف اپنی جان آنحضرت ﷺ پر قربان کر دینے پر آمادگی ظاہر فرما دی۔ وہ بستر پر لیٹ گئے۔ معلوم نہیں کب کچھ خون کے پیاسے ہاتھ ان تک پہنچ جائیں اور کب انہیں تلواروں کی دھار پر رکھ لیا جائے۔ علی رضی اللہ عنہ سو گئے تا کہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مقدسہ دشمنوں سے محفوظ رہ جائے۔ اس طرح انہوں نے کم عمری میں قربانی اور فداکاری کی ایک اعلیٰ ترین مثال قائم کر دی۔

مسلمان کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کی جان بچانے کے لئے اپنی جان کی بھی پروا نہیں کرتا اور اس طرح ایثار و قربانی کا تقاضا پورا کر دیتا ہے۔

(۲) حضرت حذیفہ عدوی ؓ بیان فرماتے ہیں کہ جنگ یرموک کے موقع پر میں کچھ پانی لے کر اپنے چچا زاد بھائی کی تلاش میں نکلا۔ میں نے سوچا اگر ان میں زندگی کی کچھ رمق باقی ہوئی تو میں انہیں پانی پلا دوں گا۔ اچانک وہ مجھے (زخمی ہو کر گرے ہوئے) نظر آ گئے۔ میں نے کہا: ''پانی پلاؤں؟'' انہوں نے اشارہ سے کہا: ''ہاں''۔ اچانک کسی کی ''ہائے'' کی آواز آئی' میرے بھائی نے اشارہ کیا: ''پانی ان کے پاس لے جاؤ''۔ میں ان کے پاس پہنچا' دیکھا کہ وہ ہشام بن عاص ؓ تھے۔ میں نے کہا: ''پانی پیش کروں؟'' اسی وقت انہیں ''ہائے'' کی آواز سنائی دی' ہشام ؓ نے اشارہ کیا: ''پانی ادھر لے جاؤ''۔ میں ان صاحب تک پہنچا تو وہ فوت ہو چکے تھے۔ میں ہشام ؓ کے پاس آیا تو ان کی رُوح بھی پرواز کر چکی تھی۔ میں اپنے بھائی کے پاس پہنچا تو وہ بھی دنیا چھوڑ چکے تھے۔

اللہ تعالیٰ ان مقدس ہستیوں پر بے شمار رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین!

اس طرح ان تینوں شہداء نے ایثار و قربانی کی ایک لازوال مثال قائم فرما دی۔ زندگی میں ایک سچے مسلمان کی یہی شان ہوتی ہے۔

(۳) روایت ہے کہ ابوالحسن انطاکیؒ کے پاس تیس چالیس افراد جمع ہو گئے' لیکن ان کے پاس روٹیاں اتنی کم تھیں کہ سب حضرات سیر نہیں ہو سکتے تھے۔ انہوں نے روٹیوں کے ٹکڑے کر لئے اور چراغ گل کر دیا۔ پھر مل کر کھانے کے لئے بیٹھ گئے۔ جب دستر خوان اٹھایا گیا تو معلوم ہوا کہ روٹیاں پوری کی پوری موجود ہیں' کسی نے بھی کچھ نہیں کھایا۔ بلکہ ہر شخص اسی خیال میں رہا کہ دوسرے حضرات کھالیں اور ہر ایک نے اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دی۔ معلوم ہوا کہ وہ سب کے سب صفتِ ایثار سے متصف تھے۔

(۴) جناب رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک مہمان آ گیا۔ اتفاق سے امّہات المؤمنین (رضی اللہ عنہن) میں سے کسی کے گھر میں بھی کھانے کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ ایک انصاری صحابیؓ مہمان کو اپنے گھر لے گئے۔ ان کے سامنے کھانا رکھ دیا' پھر بیوی

سے کہا: ''چراغ بجھا دو''۔ آپؓ کھانے کی طرف اس طرح ہاتھ بڑھاتے رہے کہ مہمان یہ سمجھا کہ کھا رہے ہیں' حالانکہ وہ نہیں کھا رہے تھے' بلکہ مہمان کو اپنی ذات اور بیوی بچوں پر ترجیح دیتے ہوئے ایثار سے کام لے رہے تھے۔ صبح کو جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''رات تم نے مہمان سے جس طرح حسن سلوک کیا' اللہ تعالیٰ بھی اس پر تعجب فرماتے ہیں''۔ اور یہ آیت نازل ہوگئی:

﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ﴾ (الحشر:۹)

''وہ اپنی جانوں پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود بھوکے ہوں۔''(۲)

(۵) بشر بن حارث بیمار تھے۔ اسی بیماری میں ان کی وفات ہوئی۔ اُس دوران کسی نے آ کر اپنی حاجت بیان کی۔ حضرت بشر نے اپنی قمیض اتار کر اسے دے دی' خود کسی سے عاریتاً قمیض لے کر پہنی اور اُسی قمیض میں آپؒ کا انتقال ہوا۔

مندرجہ بالا مثالوں سے ایثار کے زندہ نمونے سامنے آتے ہیں۔ ہم نے یہ مثالیں اس لئے ذکر کی ہیں کہ مسلمان ان کی روشنی میں نیکی اور ایثار کی روح پیدا کرے اور زندگی میں خود بھی اخلاق کے لحاظ سے ایک مثالی کردار ادا کرے۔ کیونکہ وہ مسلم ہے اور اس کے اسلام کا یہی تقاضا ہے۔

---

۲) صحیح البخاری' کتاب المناقب' باب ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ۔ وصحیح مسلم' کتاب الاشربۃ' باب اکرام الضیف وفضل ایثارہ۔

ضرورت رشتہ

پاکستانی نژاد مدرسِ حرمین شریفین' مقیم مکہ مکرمہ' شادی شدہ' عمر ۵۸ سال کے عقد ثانی کے لئے دینی مزاج رکھنے والی خاتون' عمر ۳۵۔۴۵ سال (بیوہ' مطلقہ' کنواری اور ذات پات کی کوئی قید نہیں) کا رشتہ درکار ہے۔ (پہلی شادی سے ایک لڑکا ہے جو برسرروزگار ہے۔ پہلی بیوی بیمار رہتی ہے)

رابطہ: سلیم انور' 46 اوورسیز سوسائٹی امیر خسرو روڈ کراچی

فون: 4532796 / 021-4538486

دلِ مُردہ دِل نہیں ہے......

ازافادات: علامہ ابن قیم الجوزیہؒ

انسان جسم اور روح دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی جسمانی پرورش کے ساتھ ساتھ روحانی تربیت کا سامان بھی مہیا کیا' اور روح وجسم کو لاحق ہونے والی بیماریوں کا علاج بھی فرمایا۔ ان امراض کی دو اقسام ہیں: دل کی بیماریاں' جسم کی بیماریاں۔ ان دونوں قسم کی بیماریوں کا ذکر قرآن کریم نے فرمایا۔ پھر دل کی بیماریاں بھی دو طرح کی ہیں:

(۱) شک وشبہ کی بیماری (۲) شہوت وگمراہی کی بیماری

یہ دونوں قسم کی بیماریاں قرآن کریم میں بیان کی گئی ہیں۔ چنانچہ مرضِ شبہ کے بارے میں قرآن کریم نے یوں کہا ہے:

﴿فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾ (البقرة:۱۰)

''ان کے دلوں میں شک کی بیماری ہے' جسے اللہ نے (خطرناک حد تک) بڑھا دیا۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا﴾ (المدثر:۳۱)

''تاکہ جن کے دلوں میں شک کی بیماری ہے اور جو خدا کے منکر ہیں' بول اٹھیں کہ بھلا اللہ کا اس مثال سے کیا قصد ہے؟''

اسی طرح اللہ نے ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے جنہیں قرآن اور سنت کو ہی اٹل یا فیصلہ کن سمجھنے کی دعوت دی جاتی ہے' تو وہ انکار کرتے ہیں یا پس پشت ڈال دیتے ہیں' فرمایا:

﴿وَاِذَا دُعُوْا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۞ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ۞ اَفِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ۚ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ

الظّٰلِمُوْنَ﴾ (النور:۴۸۔۵۰)

''جب ان کو بلایا جاتا ہے اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی طرف تا کہ رسولؐ ان کے آپس کے مقدمات کا فیصلہ کرے تو ان کی ایک جماعت انکار کرتی ہے۔ البتہ اگر ان کا کوئی حصہ ہو تو وہ اسے لینے کی غرض سے یقین کے ساتھ لپکتے ہیں۔ کیا ان کے دل بیمار ہیں یا انہیں شک و شبہ نے لپیٹ میں لے لیا ہے؟ یا انہیں اس کا خطرہ لاحق ہے کہ کہیں اللہ اور اس کے رسول ہمارے حصے کم نہ کر دیں؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ خود ظالم ہیں''۔

یہ شکوک و شبہات کے مرض ہیں۔ رہا مرضِ شہوت' تو اس کی نشاندہی ان الفاظ میں کر دی گئی:

﴿یٰنِسَاءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا﴾ (الاحزاب:۳۲)

''اے پیغمبر کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو' اگر تم پارسائی برتو تو پھر تمہاری گفتگو میں بھی کوئی لچک نہ ہونی چاہئے کہ دل میں کھوٹ رکھنے والا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے' بلکہ صاف سیدھی بات کہو''۔

یہ مسلّمات میں سے ہے کہ جب روح میں قوت آ جاتی ہے تو نفس اور طبیعت دونوں قوی ہو جاتے ہیں' اور یہ قوت بیماری کے دُور کرنے اور اسے ہمیشہ کے لئے ختم کرنے میں پوری مدد دیتی ہیں۔ پھر جب خود کسی کی طبیعت اور اس کا نفس ہی قوی ہو اور اس میں شگفتگی' خالق قلب کی قربت اور اس سے غیر معمولی تعلق اور اس سے محبت کی وجہ سے ہو' دل کا گداز اس کے ذکر سے بڑھ جاتا ہو' اور اس کی ساری قوتیں اسی صانع حقیقی کی طرف متوجہ ہوں اور ساری توانائیاں اسی کی طرف مرکوز ہوں' اسی سے فریادی ہوں' اسی پر بھروسہ ہو تو پھر کیوں نہ یہ سب سے اہم دوا' سب سے بڑی شفا کی حامل ہو گی' اور یہ قوت اس بیماری کا مکمل طور سے خاتمہ کر گزرے گی۔ یہ رات دن کا مشاہدہ ہے۔ اس کا انکار وہی کرے گا جس کو عقل سے واسطہ نہ ہو' جس کی سمجھ پر پردہ پڑا ہو' بدخواہ ہو' خدا سے دُور اور انسانیت کی حقیقت کو سمجھنے سے عاری ہو۔

رہ گیا دل کا علاج تو اس کا حق انبیاء و رُسل علیہم السلام کے لئے ہی تسلیم شدہ ہے'

(باقی صفحہ 60 پر)

قرض کا لین دین اور اسلامی تعلیمات

تحریر: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

قرض لینا اچھی بات نہیں' مگر دنیا میں رہتے ہوئے ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ قرض لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ اسی لئے اسلام میں اس ناگزیر ضرورت کا لحاظ رکھتے ہوئے قرض کے لین دین کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ قرآن مجید میں جہاں دوسرے اہم احکام بیان کئے گئے ہیں وہاں قرض کے معاملات کے سلسلہ میں آداب و ہدایات سورۃ البقرۃ میں بیان کئے گئے ہیں جہاں قرض کے معاملات کو گواہوں کی موجودگی میں لکھ لینے کی تاکید کی گئی ہے' تاکہ رقم کی مقدار اور ادائیگی کے طریق کار میں بھول چوک کا امکان نہ رہے۔ پھر قرض کے لین دین میں مدت کا تعین بھی کئی الجھنوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ اسی طرح قرض کے معاملے میں کوئی چیز رہن رکھنے کی بھی اجازت ہے' البتہ احادیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شے مرہونہ سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔

قرض لینا بھاری ذمہ داری ہے۔ قرض دار کو قرضہ کی رقم واپس کرنا ہوتی ہے۔ جب تک وہ قرض کی رقم واپس نہیں کرتا وہ زیر بار رہتا ہے۔ اگر کوئی شخص فوت ہو جائے اور اس کے ذمہ قرض کی رقم ہو تو اُس وقت تک وہ سبکدوش نہیں ہوتا جب تک اس کے وارث وہ رقم ادا نہ کریں۔ رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ جب کوئی جنازہ آتا تو پوچھ لیتے کہ اس کے ذمہ کوئی قرض تو نہیں ہے! اگر قرض ہوتا تو اس کا جنازہ پڑھنے سے گریز کرتے۔ ایک دفعہ ایک جنازہ آیا' آپ ﷺ نے پوچھا: ''اس کے ذمہ قرض ہے؟'' بتایا گیا نہیں۔ تو آپؐ نے اس کا جنازہ پڑھا دیا۔ پھر ایک اور جنازہ لایا گیا۔ آپؐ نے پوچھا: ''اس کے ذمہ قرض ہے؟'' بتایا گیا ہاں۔ پوچھا: ''یہ کچھ چھوڑ کر مرا ہے؟'' بتایا گیا کہ ہاں تین دینار۔ پس آپؐ نے اس کا جنازہ پڑھا دیا۔ پھر تیسرا جنازہ لایا گیا۔ آپؐ نے پوچھا: ''اس کے ذمہ قرض ہے؟'' بتایا گیا ہاں تین دینار۔ آپؐ نے

پوچھا: ''کیا اس نے کوئی ترکہ چھوڑا؟'' لوگوں نے کہا نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''تم خود ہی اپنے ساتھی کا جنازہ پڑھ لو''۔ یہ سن کر ابوقتادہؓ کہتے ہیں: یارسول اللہ ﷺ اس کا جنازہ پڑھا دیجئے! اس کے قرض کا ذمہ میں لیتا ہوں۔ چنانچہ آپؐ نے اس کی نماز جنازہ پڑھا دی۔(۱)

ابتدا میں تو یہ صورت حال رہی' مگر بعدازاں جب افلاس و ناداری کا دور ختم ہو گیا تو آپؐ نے اعلان فرما دیا کہ جو شخص اس حال میں مر جائے کہ اس کے ذمہ قرض ہو تو اس کے قرضے کی ادائیگی میں کر دیا کروں گا۔ اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ اس بات کو پسند نہیں فرماتے تھے کہ مرنے والا اپنے سر پر قرضہ لے کر مرے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک طرف تو خوشحال لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ ضرورت مند بھائیوں کو قرض دیں اور اس کی وصولی میں سختی نہ کریں' بلکہ سہولت کا رویہ اپنائیں' دوسری طرف قرض لینے والوں کو ہدایت کی کہ وہ جلد از جلد قرضے کی ادائیگی کی کوشش کریں۔ اگر خدانخواستہ وہ قرض ادا کئے بغیر اس دنیا سے چلے گئے تو آخرت میں یہ معاملہ ان کے لئے سنگین ہوگا اور اس کی معافی بھی نہ ہو سکے گی۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اَعْظَمَ الذُّنُوْبِ عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ يَّلْقَاهُ بِهَا عَبْدٌ بَعْدَ الْكَبَائِرِ الَّتِیْ نَهَى اللّٰهُ عَنْهَا اَنْ يَمُوْتَ رَجُلٌ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ لَا يَدَعُ لَهُ قَضَاءً))(۲)

''ان کبیرہ گناہوں کے بعد جن سے اللہ تعالیٰ نے سختی سے منع فرمایا ہے' سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی اس حال میں مرے کہ اس پر قرض ہو اور اس کی ادائیگی کا سامان نہ چھوڑ گیا ہو۔''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((نَفْسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَةٌ بِدَيْنِهِ حَتّٰى يُقْضٰى عَنْهُ))(۳)

---

۱) صحیح البخاری' کتاب الحوالات' باب ان احال دین المیت علی رجل جاز۔

۲) سنن ابی داؤد' کتاب البیوع' باب فی التشدید فی الدَّین۔

۳) سنن الترمذی' کتاب الجنائز عن رسول اللہ ﷺ' باب ما جاء عن النبی ﷺ انه قال: ((نَفْسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَةٌ بِدَيْنِهِ))

''مؤمن بندے کی روح اس کے قرضہ کی وجہ سے بیچ میں معلق رہتی ہے جب تک وہ قرض ادا نہ کر دیا جائے جو اُس پر ہے۔''

اس لئے ایسے شخص کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کے وارث جلدی سے جلدی اس کا قرض ادا کر دیں تا کہ مرنے والا راحت اور رحمت کے اس مقام پر پہنچ سکے جو مؤمنین صالحین کے لئے موعود ہے۔

قرض کا معاملہ اتنا سنگین ہے کہ شہید ہونے والے مرد مؤمن کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں سوائے قرض کے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يُغْفَرُ لِلشَّهِيْدِ كُلُّ ذَنْبٍ اِلَّا الدَّيْنَ))(٤)

''شہید ہونے والے مردِ مؤمن کے سارے گناہ (راہِ خدا میں جان کی قربانی دینے کی وجہ سے) بخش دیئے جاتے ہیں بجز قرض کے۔''

یہ اس لئے کہ حقوق العباد کا معاملہ بڑا سخت ہے۔ جس کے حقوق تلف کئے گئے ہوں وہ خود ہی بخشے گا تو بخشے جائیں گے۔ اسی طرح یا تو قرضہ ادا کیا جائے یا پھر دائن قرضے کی رقم معاف کر دے، ورنہ وہ قرضہ مؤمن کے لئے انتہائی مصیبت کا باعث بنے گا۔

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! مجھے بتلایئے کہ میں اللہ کے راستے میں صبر اور ثابت قدمی کے ساتھ اور اللہ کی رضا اور ثوابِ آخرت کی خاطر جہاد کروں اور مجھے اس حالت میں شہید کر دیا جائے کہ میں پیچھے نہ ہٹ رہا ہوں (بلکہ پیش قدمی کر رہا ہوں) تو کیا (اس شہادت اور قربانی کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ میرے سارے گناہ معاف کر دے گا؟ آپؐ نے جواب میں فرمایا: ''ہاں''۔ پھر جب وہ آدمی لوٹنے لگا تو آپؐ نے اس کو پھر پکارا اور فرمایا:

((نَعَمْ اِلَّا الدَّيْنَ ، كَذٰلِكَ قَالَ جِبْرِيْلُ))(٥)

---

٤) صحيح مسلم، كتاب الامارة، باب من قتل فى سبيل الله كفرت خطاياه الا الدّين۔

٥) صحيح مسلم، كتاب الامارة، باب من قتل فى سبيل الله كفرت خطاياه الا الدّين۔

''ہاں سوائے قرضہ کے۔ یہ بات اللہ کے فرشتے جبریل امین نے اسی طرح بتلائی ہے''۔

جب قرض کا معاملہ اتنا سنگین ہے تو انتہائی مجبوری کے سوا قرض ہرگز نہیں لینا چاہئے۔ مکان کی تعمیر یا کاروبار کرنے کے لئے کچھ قرض لینا پڑے تو مناسب حد تک قرض لیا جاسکتا ہے اور وہ بھی اتنی مقدار میں جسے واپس کرنا ممکن نظر آ رہا ہو۔ مگر شادی بیاہ اور مرگ کی فضول رسموں کی ادائیگی اور بدعات کے لئے رقم قرض لینا ہرگز عقلمندی نہیں۔ ایک تو فضول رسمیں بذاتِ خود گناہ کا کام ہیں اور پھر اس گناہ کے کام پر ادھار کی رقم خرچ کرنا تو انتہائی حماقت ہے۔ یہ تو دنیا کی خاطر عاقبت برباد کرنے کے مترادف ہے۔

اوپر ذکر ہوا کہ انتہائی ناگزیر صورت میں قرض لینے کی اجازت ہے۔ یہ قرض اتنی مقدار میں ہو کہ لینے والے کے لئے مستقبل میں اس کا ادا کرنا ممکن ہو اور اُس کی نیت بھی ادا کرنے کی ہو۔ ان حالات میں اور اس نیت کے ساتھ قرضہ لیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی واپسی کے لئے سازگار حالات پیدا فرما دیتا ہے۔ جو شخص اس نیت سے قرضہ لیتا ہے کہ اس کا ارادہ واپس کرنے کا نہیں ہوتا تو اسے نہ تو واپسی کی توفیق ہوتی ہے اور نہ ہی وہ قرضے سے فارغ ہوتا ہے' بلکہ وہ قرضہ دنیا میں بھی اس کے لئے وبال بن جاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ اَخَذَ اَمْوَالَ النَّاسِ يُرِيْدُ اَدَاءَ هَا اَدَّى اللّٰهُ عَنْهُ وَمَنْ اَخَذَ يُرِيْدُ اِتْلَافَهَا اَتْلَفَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ))(٦)

''جو شخص لوگوں سے ادھار مال لے اور اس کی نیت اور ارادہ ادا کرنے کا ہو تو اللہ تعالیٰ اس سے ادا کرا دے گا' اور جو کوئی کسی سے ادھار لے اور اس کا ارادہ ہی مار لینے کا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو تلف اور تباہ کر دے گا۔''

مقروض کو چاہئے کہ وہ قرض دینے والے کا شکر گزار ہو اور اس کے ساتھ حسن

---

٦) صحیح البخاری' کتاب الاستقراض واداء الدیون والحجر والتفلیس' باب من اخذ اموال الناس یرید اداء ها او اتلافها۔

سلوک کا مظاہرہ کرے۔ نہ صرف ادائیگی خوش اسلوبی سے کرے بلکہ کچھ زائد رقم بھی دے دے تو یہ مستحسن ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہی طرزِ عمل تھا۔ حدیث ملاحظہ فرمائیں!

عَنْ جَابِرٍ قَالَ : كَانَ لِيْ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ دَيْنٌ فَقَضٰى لِيْ وَزَادَنِيْ))(۷)

''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میرا رسول اللہ ﷺ پر کچھ قرض تھا' تو آپؐ نے جب وہ ادا فرمایا تو کچھ رقم زیادہ واپس کی۔''

اس طرح کی زائد رقم پر ربا کا اطلاق نہیں ہوتا' کیونکہ یہ رقم نہ تو کسی شرط کے تحت طے شدہ ہوتی ہے اور نہ ہی اس کا مطالبہ کیا جاتا ہے' بلکہ یہ تو محض حسن سلوک کے طور پر رضا کارانہ ہوتی ہے۔ اس لئے یہ سود نہیں بلکہ تبرع اور احسان ہے۔ اس طرح کی سنتوں کو رواج دینا آج کی ضرورت ہے۔

ایک ضرورت مند شخص ادھار مانگتا ہے۔ ایسے شخص کی مدد کرنا اور اسے قرض کی رقم فراہم کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔ مقروض کو ایسے شخص کے احسان کو یاد رکھنا چاہئے اور رقم کی واپسی کی کوشش کرنی چاہئے۔ اگر مقروض وقت پر رقم ادا نہ کر سکے تو اس کی بدحالی اور مجبوری کے پیش نظر قرض کا تقاضا کرنے والا اگر اس کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوئے اسے مہلت دیتا ہے اور نرمی اختیار کرتا ہے تو بہت بڑا ثواب حاصل کرتا ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((رَحِمَ اللّٰهُ رَجُلًا سَمْحًا اِذَا بَاعَ وَاِذَا اشْتَرٰى وَاِذَا اقْتَضٰى))(۸)

''اللہ کی رحمت اس بندے پر جو بیچنے میں' خریدنے میں اور اپنے حق کا تقاضا کرنے اور وصول کرنے میں نرم اور فراخ دل ہو''۔

بخاری اور مسلم میں ایک حدیث ہے کہ ایک شخص سے اُس کی موت کے بعد پوچھا جائے گا کہ اپنی دُنیوی زندگی پر نظر ڈال اور بتا کہ تیرا کوئی نیک عمل ہے جو تیرے لئے وسیلہ نجات بن سکے؟ وہ عرض کرے گا کہ میرے علم میں میرا کوئی ایسا عمل نہیں سوائے اس کے کہ میں لوگوں کے ساتھ کاروبار اور خرید و فروخت کا معاملہ کیا کرتا تھا تو میرا

---

۷) سنن ابی داوٗد' کتاب البیوع' باب فی حسن القضاء۔

۸) صحیح البخاری' کتاب البیوع' باب السھولۃ والسماحۃ فی الشراء والبیوع ومن طلب حقا۔

رویہ ان کے ساتھ درگزر اور احسان کا ہوتا تھا۔ میں مال دار کو بھی مہلت دیتا تھا اور غریبوں اور مفلسوں کو معاف بھی کر دیتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ اس شخص کے لئے جنت میں داخلہ کا حکم فرما دے گا۔(۹)

ضرورت مند کو قرض دے کر تقاضا کرنے میں نرمی اختیار کرنا اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑا ہی محبوب اور مقبول عمل ہے۔ حضرت ابوالیسر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا' آپؐ ارشاد فرماتے تھے:

((مَنْ اَنْظَرَ مُعْسِرًا اَوْ وَضَعَ عَنْهُ اَظَلَّهُ اللّٰهُ فِیْ ظِلِّهٖ))(۱۰)

''جو بندہ کسی غریب تنگدست کو مہلت دے یا معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے سایۂ رحمت میں لے لے گا۔''

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ كَانَ لَهٗ عَلٰى رَجُلٍ حَقٌّ فَمَنْ اَخَّرَهٗ كَانَ لَهٗ بِكُلِّ يَوْمٍ صَدَقَةٌ))(۱۱)

''جس آدمی کا کسی دوسرے بھائی پر کوئی حق (قرضہ وغیرہ) واجب الادا ہو اور وہ اس مقروض کو ادا کرنے کے لئے دیر تک مہلت دے دے تو اُس کو ہر دن کے عوض صدقہ کا ثواب ملے گا۔''

اسی طرح قرض دے کر کسی ضرورت مند کی مدد کرنا بہت بڑا کار ثواب اور اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول عمل ہے۔ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((دَخَلَ رَجُلٌ الْجَنَّةَ فَرَاٰى عَلٰى بَابِهَا مَكْتُوْبًا اَلصَّدَقَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا وَالْقَرْضُ بِثَمَانِيَةَ عَشَرَ))(۱۲)

''ایک آدمی جنت میں داخل ہوا تو اس نے جنت کے دروازے پر لکھا دیکھا کہ صدقہ کا اجر و ثواب دس گنا ہے اور قرض دینے کا اٹھارہ گنا۔''

---

۹) صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔

۱۰) صحیح مسلم' کتاب الزھد و الرقائق' حدیث جابر الطویل و قصۃ ابی الیسر۔

۱۱) مسند احمد' کتاب اوّل مسند البصریین' باب حدیث عمران بن حصین۔

۱۲) رواہ الطبرانی فی الکبیر۔

یہ کسی مردِ صالح کا خواب ہو سکتا ہے یا پھر خود آپ ﷺ کا مشاہدہ۔ اس دوسرے احتمال کی تائید ابن ماجہ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کے آخر میں آپ ﷺ نے فرمایا:

''میں نے جبریل سے پوچھا قرض میں کیا خاص بات ہے کہ وہ صدقہ سے افضل ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ سائل اس حالت میں بھی سوال کرتا اور صدقہ لے لیتا ہے جبکہ اس کے پاس کچھ ہوتا ہے اور قرض مانگنے والا قرض جب ہی مانگتا ہے جب وہ محتاج اور ضرورت مند ہوتا ہے''۔ (۱۳)

بعض اوقات آدمی مفلسی کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے' مگر اس کی عزتِ نفس یہ گوارا نہیں کرتی کہ وہ کسی سے صدقہ وخیرات یا زکوٰۃ لے کر اپنی اور بچوں کی ضرورت پوری کرلے' بلکہ وہ چاہتا ہے کہ کسی صاحب خیر سے رقم بطورِ قرض مل جائے۔ تو ایسے محتاج کو قرض دینا یقیناً صدقہ اور خیرات سے بھی افضل ہے۔

حاصل کلام یہ کہ عام حالات میں قرض لینے سے ضرور بچنا چاہئے' کیونکہ قرض بہت بھاری ذمہ داری ہے۔ اگر اس کو واپس نہ کیا جائے تو اس کی معافی کی کوئی صورت نہیں سوائے اس کے کہ خود صاحب مال معاف کر دے' مگر قیامت میں کون معاف کرے گا جب کہ نفسانفسی کا عالم ہوگا۔ خاص طور پر شادی بیاہ اور مرگ کی فضول رسومات کو قرض لے کر پورا کرنا دُنیوی اور اُخروی دونوں اعتبارات سے خسارے کا موجب ہے۔ پھر خود ساختہ بدعات کے لئے قرض لے کر خرچ کرنا تو اور بھی برا ہے۔ قرض انتہائی مجبوری میں لینا چاہئے اور واپس کرنے کی نیت سے لینا چاہئے۔ ایسے قرضے کی واپسی کے لئے اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد شامل حال ہو جاتی ہے۔ حقیقی ضرورت مند کو قرض دینا بہت بڑی نیکی ہے' بلکہ جیسا کہ اوپر گزرا' ایسا قرض صدقے سے بھی افضل ہے۔

قرض کے لین دین کی دستاویز تیار کرنا ضروری ہے۔ عام طور پر اس حکم کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور مروّت کے پیش نظر قرض کی رقم اور شرائط ادائیگی پر مشتمل تحریر کی

۱۳) سنن ابن ماجہ' کتاب الاحکام' باب القرض۔

ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ مگر بعد ازاں جب جھگڑے اٹھتے ہیں تو اس حکم کی اہمیت اور اسے نظر انداز کرنے کے نقصانات سامنے آتے ہیں۔ اس لئے قرض کا معاملہ چاہے اپنوں کے ساتھ ہو یا غیروں کے ساتھ' اسے گواہوں کی موجودگی میں تحریر کر لینا ضروری ہے۔ بعض اوقات مقروض بروقت قرض ادا نہیں کر سکتا اور مزید مہلت کا خواستگار ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اسے مہلت دینا بہت بڑی نیکی ہے' کیونکہ ایسا کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ جو مال و دولت اس کے پاس ہے اصل میں وہ اللہ ہی کا مال ہے اور اس مال و دولت کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا یہ اچھا طریقہ ہے کہ اس کے ضرورت مند اور محتاج بندوں کو مال ادھار دیا جائے اور انہیں واپس ادائیگی میں سہولت دی جائے۔

بقیہ: دلِ مردہ دِل نہیں ہے.....

اس کا علاج صرف انہی کے ذریعے ممکن ہے اور انہی کے ہاتھوں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ دلوں کی اصلاح و صحت تو یہی ہے کہ وہ اپنے پروردگار کے عارف ہوں اور اپنے پیدا کرنے والے کو پہچانتے ہوں' اس کے اسماء' اس کی صفات' اس کے افعال' اس کے احکام سے کما حقہ واقف ہوں اور باری تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی پسندیدگی کی جانب ان کا رُخ ہو۔ اس کی مناہی اور غصے کی باتوں سے پرہیز کرنے والے ہوں' اس لئے کہ دل کی صحت اور اس کی زندگی ان چیزوں کی رعایت کئے بغیر ممکن نہیں ہے اور نہ ان کا حصول انبیاء و رسل کو ذریعہ بنائے بغیر ممکن ہے۔ کسی کے دل کی توانائی اور اس کی صحت بلا اتباعِ انبیاء کے نہ ہو سکے گی۔

اہم اطلاع

ہفت روزہ "ندائے خلافت" ماہنامہ "میثاق" اور ماہنامہ "حکمت قرآن" کے

انٹرنیٹ ایڈیشن

تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org

پر مطالعے کے لئے دستیاب ہیں

قسط وار سلسلہ (۴)

جدید دنیائے اسلام

افغانستان

تحقیق وتحریر: سید قاسم محمود

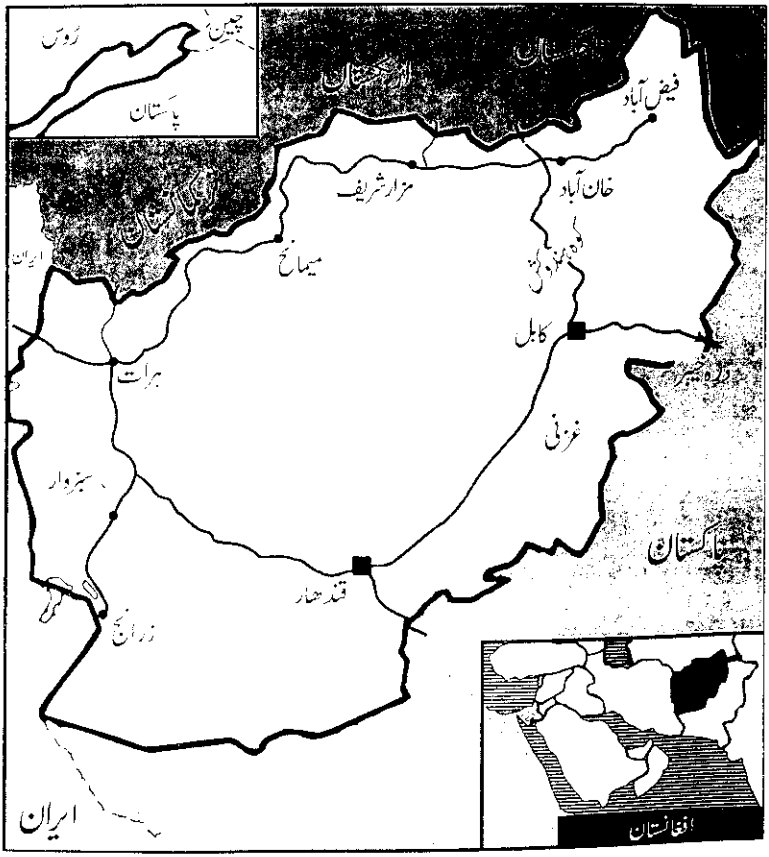

افغانستان: ایک نظر میں

سرکاری نام: دولتِ اسلامیہ افغانستان
صدر: حامد کرزئی (۲۰۰۲ء)
رقبہ: اڑھائی لاکھ مربع میل (۶ لاکھ ۴۷ ہزار ۵۰۰ مربع کلومیٹر)
آبادی: دو کروڑ ۷۷ لاکھ
شرح افزائش: ۲.۴ فیصد
شرح پیدائش: ۴۱.۰۰ فی ہزار نفوس
گنجانی آبادی: ۱۱۱ فی مربع کلومیٹر
دارالحکومت: کابل (آبادی ۲۵ لاکھ کے قریب)
بڑے شہر: مزار شریف (آبادی اڑھائی لاکھ)، قندھار (سوا دو لاکھ)، ہرات (پونے دو لاکھ)
زرکی اکائی: افغانی
زبانیں: پشتو، دری فارسی، ازبک، ترکمانی اور مزید چھوٹی چھوٹی تیس زبانیں
نسلیں: پشتون (۳۸ فیصد)، تاجک (۲۵ فیصد)، ازبک (۶ فیصد)، ہزارہ (۱۹ فیصد)، باقی ترکمان، قزلباش، بلوچ اور دیگر
مذہب: ۸۴ فیصد مسلمان، زیادہ تر سنی، شیعہ ۱۵ فیصد، باقی سکھ اور دوسرے مذاہب
شرح خواندگی: ۲۹ فیصد
مجموعی قومی پیداوار (۲۰۰۲ء میں) ۲۱ ارب ڈالر
فی کس آمدنی: ۸۰۰ ڈالر سالانہ
افراطِ زر: (دستیاب نہیں)
بے روزگاری: (دستیاب نہیں)
قابل کاشت رقبہ: ۱۲ فی صد
زراعت: گندم، پھل، مونگ پھلی، تربوز، اون، پوست، قراقلی
صنعتیں: قالین سازی، سیمنٹ، کپڑا، کھاد، صابن، جوتے، نیل، کوئلہ، تانبا
اہل محنت: ایک کروڑ
زراعت سے وابستہ ۷۰ فیصد
صنعت و حرفت ۱۵ فیصد
تعمیراتی کام ۶.۳ فیصد۔
باقی دیگر خدمات
قدرتی وسائل: قدرتی گیس، پٹرولیم، کوئلہ، تانبا، ابرق، گندھک، سرمہ، جست، خام لوہا، نمک، قیمتی ہیرے
برآمدات: کل سالانہ مالیت ۸۰ ملین ڈالر، پوست، پھل، مونگ پھلی، دستی قالین، اون، کپاس، کھالیں، ٹوپیاں، قیمتی ہیرے
درآمدات: کل سالانہ مالیت ۱۵۰ ملین ڈالر، خوراک، اشیائے صرف
تجارتی ساتھی: پاکستان، ایران، جاپان، سنگاپور، بھارت، برطانیہ، بلجیم، لکسمبرگ، چیکوسلاواکیہ، جنوبی کوریا، جرمنی

جو ملک اب افغانستان کے نام سے موسوم ہے' اس کا یہ نام صرف اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط سے شروع ہوا' یعنی جب سے افغان قوم کو ایک مسلمہ سیادت حاصل ہوگئی۔ اس سے پہلے ملک کے اقطاع کے الگ الگ نام تھے' لیکن پورا ملک ایک معیّنہ سیاسی وحدت نہیں تھا اور اس کے مشمولہ حصے نسلی یا لسانی یکسانی سے باہم مربوط نہ تھے۔ افغانستان کا قدیم مفہوم محض ''افغانوں کی سرزمین'' تھا' یعنی ایک محدود علاقہ' جس میں موجودہ مملکت کے بہت سے اقطاع شامل نہ تھے' البتہ بعض بڑے بڑے اضلاع شامل تھے جو اَب آزاد ہیں یا پاکستان کی حدود میں آ چکے ہیں۔ ملک کی سیاسی تقسیم اس کی طبعی ساخت کے مطابق ہوئی ہے:

(۱) کابل: ولایتِ کابل دریائے کابل' دریائے لوگر اور دریائے تگاؤ کے بالائی حصوں کی زرخیز اور مرتفع آبادیوں' غزنہ' نیز جلال آباد کے قریب وادیٔ کابل کے زیریں حصے پر مشتمل ہے۔ پہلے اس علاقے کا اہم ترین شہر غزنہ تھا' لیکن گزشتہ چار سو سال سے کابل نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ مغل بادشاہوں کے عہد میں کابل کو حکومتی مرکز تسلیم کرلیا گیا تھا اور درانی بادشاہوں نے بجائے قندھار کے اسی کو اپنا دارالسلطنت بنالیا تھا۔

(۲) قندھار: ولایتِ قندھار زمین داور کے قدیم صوبے پر مشتمل ہے۔ اس میں دریائے ہلمند' زنگ' ارغنداب اور ارغسان کی زیریں وادیاں شامل ہیں۔ درانی زیادہ تر یہیں آباد تھے۔ موجودہ شہر قندھار چودھویں صدی عیسوی سے اس ولایت کا حکومتی مرکز چلا آ رہا ہے۔

(۳) سیستان: اس گرم' زرخیز اور سیراب علاقے کا نام ہے جو ہامون کے اردگرد واقع ہے' مگر اس کا بڑا حصہ ایران کی مملکت میں شامل ہے۔ اس میں کوئی بڑا شہر آباد نہیں۔ اسے سجستان بھی کہتے ہیں۔

(۴) ہرات: ہری رود کی زرخیز وادی اور اس کھلے میدانی علاقے پر مشتمل ہے جو کوہستان ہزارہ درسرحد ایران کے درمیان واقع ہے۔ اس ولایت کا دارالحکومت شہر ہرات تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اگرچہ یہ سابقہ عظمت وشان کھو چکا ہے' تاہم اب بھی ایک اہم مقام ہے۔ اس ولایت کے جنوبی حصے کا سبزوار بھی ایک بارونق شہر ہے۔

(۵) ہزارستان: یہ وہ علاقہ ہے جو قدیم زمانے میں غور کے نام سے مشہور تھا۔ شہر غور کے کھنڈر تقریباً قدیم زمانے کے دارالحکومت فیروزکوہ کے محلِ وقوع کی نشان دہی کرتے ہیں' جہاں بارہویں صدی عیسوی میں شاہانِ غور حکمرانی کرتے تھے۔ اب اس علاقے میں کوئی اہم شہر آباد نہیں۔

(۶) ترکستان: کوہ بابا کے شمال میں دریائے جیحوں تک جو علاقہ چلا گیا ہے' اسے ترکستان کہتے ہیں۔ اس کا پرانا حکومتی مرکز بلخ اب اپنی گزشتہ اہمیت کھو چکا ہے۔ اس کے موجودہ انتظامی مراکز مزار شریف' تاش کرگان اور میمنہ ہیں۔

(۷) بدخشاں: جو علاقہ کوہِ ہندوکش کے شمال اور ترکستان کے مشرق میں دریائے جیحوں کے

بائیں کنارے واقع ہے' اسے بدخشاں کہتے ہیں۔ اس علاقے کو دریائے قندز اور اس کے معاون سیراب کرتے ہیں۔

(۸) وَخان: مزید مشرق میں جو طویل کوہستانی وادی پامیر تک پھیلی ہوئی ہے' اسے وَخان کہتے ہیں۔

(۹) نورستان: ہندوکش کا ایک پہاڑی حصہ' جو وادیٔ کابل کے شمال اور کنڑ کے مغرب میں واقع ہے' اس کا نام پہلے کافرستان تھا' لیکن جب ۱۸۹۶ء میں امیر عبدالرحمٰن خان نے اس ملک کو سر کیا تو اس کا نام بدل کر نورستان رکھ دیا گیا۔

آج کل افغانستان سات بڑے صوبوں اور گیارہ چھوٹے صوبوں پر مشتمل ہے۔ ہر بڑے صوبے کا گورنر نائب الحکومت اور چھوٹے صوبے کا حاکم اعلیٰ کہلاتا ہے۔

سات بڑے صوبے یہ ہیں: کابل' مزار شریف' قندھار' ہرات' قطغن' بنگر ہار اور پاکتیا۔

گیارہ چھوٹے صوبے یہ ہیں: بدخشاں' فراہ' غزنی' پروان' گرشک' میمنہ' شبرغان' غورات' طالقان' ارزگان اور بامیان۔

قبل از اسلام

ان علاقوں میں جو اَب افغانستان کہلاتے ہیں' پہلی اور دوسری ہزاری (قبل از مسیح) میں' جب آریاؤں کی نقل مکانی جاری تھی' ایرانی قبائل بستے تھے' جنہیں سائرس (خسرو) نے چھٹی صدی قبل مسیح میں ہخامنشی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ سکندر مقدونی کی فتوحات کے بعد یہ علاقے یونانی اور پارتھیوں کے درمیان وجہِ جنگ بنے رہے۔ پہلی صدی قبل مسیح میں یوچی قوم کے قبیلے کوشان کے زیر قیادت مزید ایرانی قبائل افغانستان میں داخل ہوئے۔ کوشانی سلطنت دوسری عیسوی میں کنشک کے عہد میں معراجِ کمال کو پہنچی۔

یوچی قبیلے کے بادشاہ کیدارا نے جلد ہی فتوحات کا دائرہ کوہستان ہندوکش کے جنوب تک بڑھا کر کابل' غزنی' سوات اور پشاور کا علاقہ اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں کوہِ ہندوکش کی جنوبی جانب ایک نیا خاندان برسرِ حکومت تھا۔ اس کے دو بادشاہوں تورامانا اور مہرگل نے شمالی ہندوستان میں وسیع فتوحات حاصل کیں۔ مہرگل نے' جو سورج دیوتا مہرہ کا پرستار تھا' ظالمانہ داروگیر کی نہایت تلخ یادیں پیچھے چھوڑیں۔ ظلم وستم اس وقت تک جاری رہا جب تک ہندوستان کے راجے مہاراجوں نے متحد ہو کر اس کا سر نہیں کچل دیا۔

ان دو سلطنتوں کی تباہی کے بعد اُن کے علاقے چھوٹے چھوٹے امراء کے قبضے میں رہے' جن میں سے بعض ساسانیاں ایران کے باج گزار تھے اور بعض ترکوں کی اطاعت کا دم بھرتے تھے ساتویں صدی کے وسط میں افغانستان کی سیاسی کیفیات کا نقشہ چینی سیاح ہیون سانگ کے سفرنا میں کھینچا گیا ہے۔ ہیون سانگ کی سیاحت کے کچھ عرصہ بعد چین کے شاہی خاندان تنا نگ نے مغر

ترکوں کا قلع قمع کر دیا اور اپنا اقتدار مغربی علاقے تک قائم کر لیا۔ تقریباً سو سال تک (۶۵۹ء تا ۷۵۱ء) ہندوکش کے شمال اور جنوب کی سولہ بادشاہیاں چینیوں کی بالادستی تسلیم کرتی رہیں۔ مسلمان فاتحین کو جنہوں نے ایران کی مملکت کو تو بڑی تیزی سے سر کر لیا تھا' افغانستان کے ان حصوں کے آخری چھوٹے چھوٹے فرماں رواؤں کی طرف سے شدید اور مسلسل مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ کہیں نویں صدی عیسوی کے اواخر میں جا کر کوہ ہندوکش کی جنوبی جانب مسلمان پوری طرح کامیاب ہوئے۔

افغانستان میں ظہورِ اسلام

ساتویں صدی عیسوی میں' جب آفتابِ اسلام طلوع ہو رہا تھا' افغانستان دو سیاستوں اور دو مذہبوں سے متاثر تھا۔ مغربی حصے یعنی سجستان (سیستان)' ہرات اور اس کے ملحقہ علاقوں پر ایرانی ساسانیوں کا سیاسی' ادبی اور مذہبی اقتدار قائم تھا' جن کا مذہب زردشتی تھا اور زبان پہلوی تھی۔ مشرقی حصے' یعنی وادیٔ دریائے کابل میں کابل سے قندھار تک بدھ مت اور برہمنیت رائج تھے۔ ظہورِ اسلام کے وقت افغانستان قبائلی حکمرانوں میں منقسم تھا اور یہاں پشتو' پہلوی' مغولی' نیز سنسکرت کی پراکرتیں رائج تھیں۔ مغرب میں زردشتی کے پیرو تھے اور مشرق میں بدھ مت' برہمنیت اور شیومت کے نام لیوا۔ گویا یہاں یونانی' ہندی' مغل اور ایرانی عناصر کا ایک مخلوط تمدن ظہور پذیر ہو چکا تھا۔

ابھی آفتابِ اسلام کو طلوع ہوئے زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں عربوں کے جہاں گیر لشکر نے ایران میں ساسانیوں کی قدیم شہنشاہیت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ ان کے آخری شہنشاہ یزدگرد نے جلولا اور نہاوند کی لڑائیوں میں شکست کھانے کے بعد خراسان اور بلخ کی طرف راہِ فرار اختیار کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے احنف بن قیس نے یزدگرد کا تعاقب کیا اور جنگ کیے بغیر خراسان فتح کر لیا۔ ادھر جنوب میں بھی عبداللہ بن بدیل خزاعی کے زیرِ قیادت عربوں کا ایک لشکر خراسان کے دروازوں تک پہنچ چکا تھا۔ یہ علاقے افغانستان کی موجودہ مغربی سرحد یعنی گرم سیر سے متصل ہیں۔

عہد عثانیؓ (۲۵ تا ۳۵ ہجری) میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ اور بڑھا۔ عبداللہ بن عامر نے شدید محاصرے اور جنگ کے بعد کابل فتح کر لیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے احنف بن قیس کو مرو اور ہرات میں' خمیب بن قرۃ کو بلخ وطخارستان میں اور عبداللہ بن عمیر لیثی کو سیستان میں حاکم مقرر کیا۔ ۳۰ ہجری /۶۵۰ء کے لگ بھگ ربیع بن زیاد سیستان آیا۔ یہاں کے حاکم نے مصالحت چاہی اور زرنج مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ ربیع کی مراجعت کے بعد اس نے شورش برپا کر کے اس کے نائب کو زرنج سے نکال دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اب ایک برگزیدہ صحابی عبدالرحمٰن بن سمرۃ رضی اللہ عنہ کو حسن بصریؒ اور متعدد فقہاء کی معیت میں زرنج بھیجا' جس کا انہوں نے محاصرہ کر لیا۔ حاکم سیستان اپرویز نے اطاعت قبول کی۔ بیس لاکھ درہم اور دو ہزار غلام دینا قبول کیے اور فقہاء کی مدد سے اسلام کی ترویج و اشاعت میں

مصروف ہوگیا۔

عہد مرتضویؓ (۳۵ تا ۴۰ ہجری) میں حضرت علی ؓ نے زیاد کو خراسان بھیجا اور اس نے وہاں امن وسکون قائم کیا۔ ایک اسلامی لشکر سیستان سے نکلا اور موجودہ قلات تک بڑھتا چلا گیا جہاں بیس ہزار قبائلیوں نے پرزور مدافعت کی۔ خونریز لڑائی اور طویل محاصرے کے بعد مسلمانوں نے ان کے ہزار ہا افراد کو گرفتار کر کے انہیں منتشر کر دیا' لیکن اس لڑائی میں سالار لشکر حارث بن مُرہ شہید ہو گئے۔

عہد اُموی (۴۱ تا ۱۳۲ھ): امیر معاویہ ؓ نے خراسان کی طرف لشکر روانہ کیا' جو ہرات سے جنوب مغرب کے علاقے کو فتح کرتا ہوا بلخ پہنچا اور عبادت خانۂ نوبہار کو تباہ و برباد کیا۔ اس کے نائب عطا نے بلخ کے دریاؤں پر پل باندھے' جو اَب تک اس کے نام سے منسوب چلے آتے ہیں۔ ۷۰۵ء میں مشہور فاتح قتیبہ بن مسلم کو حجاج بن یوسف کی سفارش پر خلیفہ عبدالملک نے خراسان کا حاکم مقرر کیا۔ قتیبہ نے بلخ' طالقان اور طخارستان فتح کئے' پھر ماوراء النہر میں فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس طرح شمالی افغانستان کا موجودہ علاقہ ہمیشہ کے لئے حلقہ بگوشِ اسلام ہوا۔

جنوبی افغانستان میں ۶۶۳ء میں امیر معاویہ ؓ نے عبدالرحمٰن بن سمرۃ ؓ کو سیستان کا حاکم بنا کر بھیجا تھا۔ اس نے ۶۶۴ء میں منجنیقوں کی مدد سے کابل فتح کر لیا۔ اس فتح کے دوران میں ایک بڑے فاضل صحابی ابورفاعہ عدوی تمیمؓ نے جامِ شہادت نوش کیا۔ ان کا مزار اب تک کابل میں مشہور ہے۔ اسی سال عبدالرحمٰن بن سمرہ کے حکم سے مہلب بن ابی صفرہ ایک لشکر لے کر درۂ خیبر کے راستے پشاور کی طرف بڑھا اور کابلشاہ کو شکست دی' جس کے پاس سات ''ژندہ پیل'' اور ہر ''ژندہ پیل'' کے ساتھ چار ہزار سوار تھے۔ اس کے بعد مہلب نے دریائے سندھ عبور کیا اور لاہور وملتان ہوتا ہوا حدودِ قلات میں خضدار تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ یوں بنی اُمیہ کے زوال تک پورا افغانستان زبردست قبائلی مزاحمت کے باوجود دائرہ اسلام میں داخل ہوا' بلکہ ۷۱۴ء تک اسلامی لشکر سمندر کے راستے ہندوستان پہنچ کر سندھ وملتان فتح کر چکے تھے۔

عہد عباسی (۱۳۲ھ تا ۲۰۵ھ): خلافتِ راشدہ اور اُموی سلطنت کا ۱۳۰ سال کا دَور زیادہ تر جنگ وجدال ہی میں گزرا۔ جب تک بنو ہاشم اور بنو اُمیہ کے حامی قبائل میں اختلافات جاری رہے افغانستان کے باشندے آلِ ہاشم کے طرف دار رہے۔ جب بنو اُمیہ پر زوال آنے لگا تو خراسان کے ایک بااثر شخص ابومسلم مروزی نے خلافت بنی ہاشم کی تحریک کا آغاز کر دیا۔ ۷۴۱ء میں اس نے کوفے جا کر عباسی امام ابراہیم سے ملاقات کی اور لوگوں کو آلِ عباس کی حمایت پر ابھارا۔ ۷۴۶ء میں ابومسلم خراسانی نے مرو سے طخارستان تک کے باشندوں کی حمایت حاصل کر کے بنوعباس کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ ۷۴۸ء میں جب خلیفہ مروان کے حکم سے ابراہیم (بن محمد بن علی بن عبداللہؓ بن عباس) ہلاک کر دیئے گئے اور ان کا بھائی عبداللہ السفاح کوفے کی طرف بھاگ گیا تو ابومسلم خراسان سے اپنا لشکر

لے کر بڑھا۔ کوفہ میں داخل ہو کر جامع مسجد میں السفاح کے نام کا خطبہ پڑھا اور سلطنت اُموی کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔

۷۶۷ء میں استادسیس نے ہرات میں سلطنت عباسیہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ چوبیس ہزار کا لشکر اسے کچلنے کے لئے آگے بڑھا۔ استادسیس گرفتار ہوا اور اس کی بیٹی مرجیلہ کی شادی الہارون سے کر دی گئی' جس کے بطن سے المامون الرشید پیدا ہوا۔ ہارون الرشید کی تخت نشینی کے سال میں سیستان میں ایک بار پھر شورش برپا ہوئی جو کچل دی گئی۔

اب خراسان کی طرف آیئے! الہارون کے عہد میں فضل بن یحییٰ برمکی وہاں کا حاکم مقرر ہوا (۷۹۳ء)۔ اس نے ''لشکر بغداد'' کے نام سے پانچ لاکھ افراد پر مشتمل ایک مضبوط لشکر کی تشکیل کی اور بڑا اثر و رسوخ حاصل کر لیا۔ افغانستان کے جن مقتدر خاندانوں نے خلافتِ بنی عباس کے قیام میں ابومسلم خراسانی کا ساتھ دیا' ان میں غور کا سوری خاندان قابل ذکر ہے۔

افغانستان کے تمدنی اور معاشرتی حالات

پہلی دو صدیوں ہی میں اسلام نے افغانستان میں مذہب زردشت' بدھ مت اور برہمنیت کی جگہ لے لی۔ عربی زبان اور رسم الخط پورے ملک میں پھیل گیا۔ تاہم مشرقی افغانستان میں آئندہ اڑھائی سو سال تک سنسکرت رسم الخط عربی کے کوفی رسم الخط کے ساتھ ساتھ جاری رہا۔ چنانچہ عربی کا قدیم ترین کتبہ (جمادی الاوّل ۲۴۳ھ/۸۵۷ء) جو ٹوچی کی وادی میں دستیاب ہوا ہے' عربی اور سنسکرت دونوں زبانوں میں ہے اور عجائب خانہ پشاور میں محفوظ ہے۔ خراسان' ہرات اور سیستان میں بھی پہلوی زبان نے اپنی جگہ موجودہ دری فارسی کے لئے خالی کر دی اور اسلامی علوم (یعنی تفسیر' حدیث' رجال اور سیرت) افغانستان میں رواج پا گئے۔

زرنج' بلخ' ہرات' مرو وغیرہ میں بڑے بڑے اسلامی مدرسے کھل گئے اور اس سرزمین سے مشہور زاہد اور فاضل بزرگ پیدا ہوئے۔ مثلاً امام اعظم ابوحنیفہ' ابن المبارک مروزی' محمد بن کرام سیستانی (بانیٔ مسلک کرامیہ)' ابراہیم بن طہمان محدث' ابواسحاق بن یعقوب محدث' مشہور صوفی ابراہیم ادھم بلخی' مشہور حنفی فقیہہ ابوسلیمان موسیٰ جوزجانی' ابراہیم بن رستم (جو امام ابوحنیفہ کے تلامذہ میں سے تھے)' ابوداؤد (صاحب سنن)' ابی حاتم سہل محدث' ابومعشر (ماہر فلکیات اور منجم)' ابن قتیبہ (مورخ)' بشار بن مرد (عربی شاعر) اور علی بن جہم (عربی شاعر) وغیرہ۔

افغانستان' بالخصوص اہل خراسان' مثلاً برامکہ کے ذریعے ایرانی تمدن اور عجمی آدابِ معاشرت عباسیوں کے دربارِ خلافت میں منتقل ہوئے۔ عربی زبان اور دری زبان نے مل کر موجودہ فارسی کی صورت اختیار کی۔ عرب فاتحین افغانستان کے بڑے بڑے شہروں میں بہت زیادہ تعداد میں آباد ہو گئے۔ اس طرح ایک مخلوط تہذیب اور ایک مخلوط نسل وجود میں آئی اور یہاں عربوں کے آداب و رسوم

کی اشاعت ہونے لگی۔ مستقل آباد ہونے والے عربوں سے قطع نظر افغانستان کے اندر مقیم افواج میں عربوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔

اُموی اور عباسی دَور میں ملتان' دیبل' منصورہ' الور' قلات' خضدار وغیرہ اور کشمیر سے دریائے سندھ کے دہانے تک وادیٔ سندھ اور توران (بلوچستان کا ایک حصہ) کے آباد اور پُر رونق شہروں اور تجارتی مرکزوں سے ہندوستانی مصنوعات خراسان' سیستان اور ہرات کے راستے ایران' عراق اور شام کے شہروں میں لائی جاتی تھیں۔ پنجاب کے تجارتی قافلے کابل' غزنی' خراسان' بخارا اور ماوراء النہر میں سے گزرتے تھے اور وہاں سے چینی کے برتن ہندوستان لے جاتے تھے۔ مشہور سامانِ تجارت میں خراسان اور مرو کا ریشمی کپڑا بھی ہوتا تھا۔

اُموی اور عباسی خلفاء کے سکوں کے علاوہ افغانستان میں' سندھ کی گزرگاہ تک' غیر اسلامی سلطنتوں کے سکے بھی رائج تھے۔ بعض اوقات ساسانی بادشاہوں اور گندھارا' پنجاب اور باختر کے بدھ اور ہندو فرماں رواؤں کے سکوں پر خلیفہ کا نام اور کلمۂ طیبہ ضرب کر دیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں ہر افغانی بادشاہ اپنے اور خلیفہ وقت کے سونے اور چاندی کے سکے کوفی رسم الخط میں جاری کرتا تھا۔ البتہ آگے چل کر غزنوی دَور میں بعض سکے سنسکرت رسم الخط میں بھی مضروب ہوئے۔ ایک سکہ ''گندھارا'' کے نام سے منسوب تھا۔ یہ سکے ملتان سے اسماعیلی اور لودھی حکمرانوں نے ضرب کروائے تھے۔

سلطنت اُموی کی سیاسی تقسیم یوں تھی کہ خراسان سے کابل' پنجاب اور سندھ تک کا تمام مفتوحہ علاقہ ولایتِ عراقِ عجم میں شامل تھا' جس کے والی کی طرف سے دو گورنر مقرر کئے جاتے تھے۔ ایک حاکمِ خراسان ہوتا تھا جس کا صدر مقام مرو تھا' اور دوسرا حاکمِ کابل' جو پنجاب اور سندھ کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ عہد عباسیہ میں افغانستان کی سیاسی تقسیم یوں ہوگئی تھی: (۱) ولایتِ خراسان' جو نیشاپور اور ہرات سے بلخ اور طخارستان کے علاقے پر مشتمل تھی' (۲) ولایتِ سیستان جو کابل تک پھیلی ہوئی تھی' اور (۳) ولایت توران و مکران' جو سندھ کی حدود تک وسیع تھی۔

ان ولایتوں (صوبوں) میں باقاعدہ دفتری اور مالی نظام قائم تھا۔ مالیات' ڈاک' فوج' رسل و رسائل' نقل و حمل' صدقات' اوقاف' وظائف (تنخواہ)' پولیس اور عدالت کے محکمے موجود تھے۔ لشکر عموماً سوار اور پیادہ فوجوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ تلوار' زرہ' خود' نیزہ' تیر' کمان' منجنیق' دبانہ اور ضبور (ٹینک کی ابتدائی شکل) سے مسلح' فوج کی وردی قمیص' اونچی شلوار اور چپلی پر مشتمل تھی' یعنی آج کل کے پہاڑی افغانوں کا عام لباس۔ لشکر کے دستے پانچ حصوں میں تقسیم کئے جاتے تھے: (۱) قلب' جو قائدِ عمومی کی کمان میں ہوتا تھا' (۲) میمنہ' یعنی دائیں ہاتھ کا لشکر' (۳) میسرہ' یعنی بائیں ہاتھ کا لشکر' (۴) کتیبہ یا مقدمہ' یعنی سامنے کا یا درمیانی لشکر جو زیادہ تر سواروں پر مشتمل ہوتا تھا' (۵) ساقہ' جو لشکر کے پیچھے رہتا تھا اور اس میں لشکر کے بڑے بڑے قائدین (غالباً عرب) رہتے تھے۔

عدلیہ کے انتظام کی تفصیل یہ تھی کہ صحابہ کرامؓ اور تابعین کو خلیفۂ وقت کی طرف سے بڑے بڑے شہروں میں مقرر کیا جاتا تھا جو قرآن' سنت' اجماع اور قیاس کے مطابق جھگڑوں کا فیصلہ کرتے تھے۔ وہ اپنے اجتہاد اور نفاذِ شریعت میں امراء کی سیاست کے اثر سے آزاد تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز فرماتے ہیں: ''قاضی میں پانچ صفات کا ہونا ضروری ہے' یعنی علم' حرص سے پاک ہونا' تحمل اور بردباری' ائمہ کی پیروی اور اہل علم اور اصحاب الرائے سے صحبت رکھنا''۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر' پیمائش واوزان' لین دین کے معاملات کی نگرانی اور احکامِ دین کی تبلیغ کے لئے شرعی محتسب مقرر تھے۔ علماء وصلحاء مفتوحہ علاقوں میں تبلیغ اسلام کے لئے آتے رہتے تھے۔ ۶۹۲ء میں سیستان اور زابلستان کے عرب حاکم ربیع الحارثی نے مشہور عالم اور صوفی بزرگ حضرت حسن بصری کی مدد سے اپنی ولایت میں اسلامی قوانین رائج کئے تھے۔

افغانوں کی قومی مملکت کے قیام تک

عہد طاہریان (۸۲۰ء۔۸۷۳ء)

طاہریوں کا اثر ورسوخ مغربی وشمالی افغانستان تک محدود تھا اور جنوبی ومشرقی افغانستان پر کابلشاہی ہندو حکمران تھے۔ آلِ طاہر نے خلافتِ بغداد سے دوستانہ مراسم قائم رکھے۔ ان کی درباری اور ادبی زبان عربی تھی۔ انہوں نے افغانستان میں بچے کھچے زردشتیوں کے خلاف متعدد اقدامات کئے۔ اس خاندان کے آخری حکمران محمد بن طاہر کو یعقوب بن لیث صفاری نے قید خانے میں ڈال کر طاہری خاندان کا سلسلہ ختم کر دیا۔

عہد صفاریان (۸۶۱ء۔۱۰۰۳ء)

بنی اُمیہ اور بنی عباس کے عہد میں سیستان ہمیشہ سیاسی تحریکوں' خصوصاً خوارج کا مرکز رہا۔ انہی دنوں یہاں ''اہل فتوت'' نے زور پکڑا جو موجودہ سیاسی جماعتوں کی طرح کی ایک جمعیت تھی۔ اس کے ایک رکن یعقوب نے' جو ایک ٹھیرے☆ لیث کا بیٹا تھا' اپنے بھائی عمرو بن لیث کی معیت میں حاکم سیستان کے دربار میں رسائی حاصل کر لی۔ اس نے درہم اور خوارج کو شکست دے کر اہل سیستان سے بیعت لے لی۔ چونکہ خلیفہ بغداد نے اس کی حکومت تسلیم نہیں کی تھی' اس لئے وہ حاکمِ فارس کو شکست دے کر بغداد کی جانب بڑھا' لیکن شکست کھا کر خوزستان کی طرف پسپا ہوا۔ سترہ سال کی حکمرانی کے بعد فوت ہو گیا۔ یعقوب ایک منصف مزاج' کریم النفس اور شجاع انسان تھا۔ وہ پہلا مسلمان حکمران ہے جس نے دریائے آمو سے سیستان تک اور مرو اور ہرات سے کابل' گردیز اور زابلستان تک پورے افغانستان پر قبضہ کیا۔ یعقوب کا جانشین اس کا بھائی عمرو بن لیث ہوا۔ خلیفۂ بغداد نے اسے

☆ پیتل' تانبے وغیرہ کے برتن بنانے یا بیچنے والا (فیروز اللغات)

خراسان، سیستان، فارس، کرمان، سندھ اور ماوراء النہر کا حاکم تسلیم کرلیا۔ عمرو کے بعد صفاریوں کو زوال آ گیا اور بخارا کے سامانیوں نے سیستان تک شمالی افغانستان اور ہرات پر قبضہ کرلیا۔ صفاریوں کے عہد میں افغانستان کے بعض علاقوں نے، کابل سے گردیز تک بُدھ اور ہندو حکمرانوں کے اقتدار سے نجات حاصل کی۔

عہد سامانیاں (۸۹۲ء۔۹۹۹ء)

اس خاندان کا بانی سامان خداۃ، مرو میں مامون الرشید کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔ خلیفہ بغداد کے معتمد نے اس کے پوتے اسماعیل کو ماوراء النہر اور خراسان کا حکمران تسلیم کرلیا۔ یہی آلِ سامان کے سلسلے کا اصل بانی ہے۔ اس نے طخارستان سے مرو اور ہرات تک ایران کا شمالی علاقہ، ماوراء النہر اور مغربی افغانستان کا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ اس عہد کے مشاہیر میں سے دو وزیر بہت مشہور ہیں۔ ایک محمد بن احمد جیہانی، جس نے جغرافئے کی ایک کتاب مرتب کی، لیکن اب وہ مفقود ہو چکی ہے، اور دوسرے محمد بن محمد بلعمی، جس نے ''تاریخ طبری'' کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ قدیم فارسی شعراء میں سے رودکی، ابوشکور بلخی اور دقیقی اور پشتو شعراء میں سے ابومحمد ہاشم قابل ذکر ہیں۔ سامانیوں کے عہد میں فارسی زبان وادب کے ساتھ ساتھ دینِ اسلام اور تمدنِ اسلام کابل تک پھیل گیا، البتہ افغانستان کے مشرقی سرحدی علاقوں (مثلاً ننگر ہار، لغمان، خوست، منگل وغیرہ) میں قدیم زبانیں، مذاہب اور تمدن باقی رہے۔

دسویں صدی عیسوی میں کوہِ سلیمان پر افغانوں کے جدامجد عبدالرشید قیس کی حکومت تھی۔ اس کے تین بیٹے غرغشت، ٹبنی اور سربن کوئی ایک صدی تک کوہِ غور سے کوہِ سلیمان تک کے علاقے پر قابض رہے۔ کہا جاتا ہے کہ افغان قوم انہی تینوں کی اولاد میں سے ہے۔

۹۷۶ء میں جب سامانی حکمرانوں پر زوال آ گیا اور غزنہ پر لودھی حکمران امیر سبکتگین کی حکومت قائم ہوگئی تو اس کے فرزند محمود غزنوی نے شمالی افغانستان کو بھی فتح کر کے بلخ کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ ۱۱۵۷ء تک موجودہ افغانستان کا پورا علاقہ غزنویوں کی سلطنت میں شامل رہا۔ غزنوی عہد میں یہاں سے ہندو مذہب اور ہندو تہذیب پوری طرح نابود ہو گئے اور اسلام پورے افغانستان کے رگ و پے میں سما گیا۔ اس عہد میں البیرونی، ابن سینا، ابن مسکویہ، ابوالفضل بیہقی، نصراللہ منشی ہروی، داتا گنج بخش، فردوسی، طوسی، عنصری، منوچہری، سنائی، ناصر خسرو جیسے شاعروں اور ادیبوں نے عروج پایا۔ اس دور میں فنونِ لطیفہ اور صنعت وحرفت نے بھی بے حد ترقی کی۔

غزنویوں کے تسلط سے نکل کر نیشاپور اور آس پاس کے علاقے طغرل بیگ سلجوقی کے ہاتھ میں چلے گئے تھے، چنانچہ اس نے ۱۰۶۳ء تک سیستان سے بلخ وطخارستان تک کے علاقے پر اپنا قبضہ جما لیا۔ اس کی اولاد آلِ سلجوق یا سلاجقہ کہلائی۔ اس سلسلے کے ایک سلطان سنجر نے غزنوی حکمران بہرام

ارسلان کے ماتحت غزنہ سے لاہور تک کے علاقے پر حکومت کی۔ اس کی حکومت کا خاتمہ ۱۱۵۷ء میں اس کے اپنے باغیوں نے کر دیا۔ انہی میں سے ایک سردار اتسز نے اپنی حکومت قائم کر لی اور اس کا خاندان آل خوارزم شاہ کے نام سے ۱۲۱۵ء تک حکمران رہا۔

اس دَور میں سیستان کے امراء نے سر ابھارا۔ انہوں نے سلجوقیوں' غوریوں اور غزنویوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کر رکھے تھے۔ خوارزم شاہیوں کے بعد انہوں نے سیستان پر خود مختارانہ حکومت کی۔ اس وقت غور پر غوری یا سوری حکمران تھے جو یہاں حضرت علیؓ کے عہد سے حاکم چلے آتے تھے۔

۱۲۶۲ء میں غیاث الدین تغلق تخت پر بیٹھا۔ اس نے بہت سے علاقے اپنی قلمرو میں شامل کر لئے۔ ۱۲۹۹ء میں اس کی سلطنت ہندوستان سے عراق تک پھیل چکی تھی اور خلیفۂ بغداد نے اسے قانونی حکمران تسلیم کر لیا تھا۔ اس کے بھائی سلطان محمد غوری کی سلطنت بنارس (ہندوستان) سے خراسان اور خوارزم سے بحیرۂ عرب تک پھیل چکی تھی۔ اس کی شہادت کے بعد غوری سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ مختلف علاقوں میں مختلف امراء کی حکومت قائم ہوگئی۔ انہی میں سے ایک سلطان قطب الدین ایبک نے چالیس روز تک غزنہ پر حکومت کی۔ اس کے بعد سے خوارزم شاہیوں نے شمالی علاقوں پر اور ملوک سیستان نے جنوبی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ غوریوں کا عہد علمی و ادبی لحاظ سے بھی افغانستان کا ایک سنہری دَور ہے۔ اس دَور میں فن تعمیر نے بھی بڑی ترقی کی۔ پشتو ادبی زبان بنی۔ امام فخر الدین رازی' نظامی عروضی' قاضی منہاج سراج' ابونصر فراہی' محمد عوفی وغیرہ اس دَور کے مشاہیر میں سے ہیں۔

اس اسلامی تہذیب کو' جو عروج کی طرف مائل تھی' ۱۲۲۰ء میں تاتاری حملہ آور چنگیز خان نے اپنے گھوڑوں کے قدموں تلے روند ڈالا۔ اس وقت افغانستان کے علاقوں پر خوارزم شاہ حکمران تھا۔ تاتاریوں نے خوارزم شاہ کو شکست دے کر اسلامی ممالک کو تاخت و تاراج کرنا شروع کیا۔ علاء الدین کے بیٹے جلال الدین خوارزم شاہ نے دو برس بعد ایک لشکرِ جرار جمع کیا اور پروان کے مقام پر چنگیزی لشکر کو شکست دی۔ ۱۲۲۷ء میں چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان نے اپنے دادا کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ایک بار پھر اسلامی تہذیب کو ملیامیٹ کرنا شروع کیا اور تاتاری قوانین نافذ کئے۔

تاتاریوں نے اپنے ہاں مسلمان مشیر بھی ملازم رکھے ہوئے تھے جو اسلامی امور' احکام و آداب کی نگرانی کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ تاتاری تمدن کو بھی فروغ ہوا۔ چین کے فن نقاشی' فن تعمیر اور پارچہ بافی کو رواج ہوا۔ اُس دَور کے فضلاء اور علماء میں مولانا روم' نصیر الدین طوسی' شیخ فرید الدین عطار' مولانا جامی' امیر حسینی غور اور سلیمان حاکو وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

۱۲۴۷ء میں تاتاری حکمران منگوخان نے اپنے ایک درباری ملک شمس الدین محمد بن ابی کرت کو سندھ سے خراسان تک کا حاکم مقرر کیا۔ اس کا خاندان آلِ کرت کے نام سے حکمران رہا' جس کا خاتمہ

۱۳۸۵ء میں امیر تیمور نے کیا۔ امیر تیمور نے اپنے پوتے محمد خان کو کابل' غزنہ اور قندھار کا والی بنایا اور اپنے بیٹے شاہ رُخ کو خراسان کی بادشاہی دے دی۔ امیر تیمور کی وفات کے بعد اُس کے ایک اور پوتے خلیل بن میراں شاہ نے غزنہ کی حکومت پر قبضہ کر لیا' جسے شاہ رُخ نے معزول کر کے افغانستان کے تمام علاقے اپنی قلمرو میں شامل کر لئے۔ اس کے جانشین عموماً آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے۔ افغانستان کا آخری تیموری حکمران بایقرا خان تھا' جس کی وفات (۱۵۰۶ء) کے بعد تمام مفتوحہ علاقے الگ الگ اور چھوٹے چھوٹے حکمرانوں میں بٹنے لگے۔ آلِ تیمور کے عہد میں علوم وفنون کو عروج ہوا۔ اس دَور کے فضلاء میں سے مولانا جامی' حسین واعظ کشفی' میر خواند' بہزاد اور عبدالرزاق سمرقندی قابل ذکر ہیں۔ اس دَور میں شہر ہرات اپنے عروج وکمال کو پہنچا ہوا تھا۔ اسی دَور میں افغان قبائل دروں میں آباد ہوئے اور اُسی دَور میں شیخ آدم ملی نے تقسیم اراضی پر ایک کتاب لکھی۔

چنگیز خان کی نسل سے ایک شخص شیبانی خان فرغانہ میں بابر کی تخت نشینی (۱۴۹۳ء) کے وقت سمرقند پر قابض ہو گیا۔ ۱۵۰۳ء میں بابر کے ساتھ اس کی جنگ ہوئی تو اس نے پسپا ہو کر افغانستان کا رخ کیا' جہاں اس اثناء میں ایل خانی خاندان حکمران تھا۔ اس کے بانی ذوالنون بیگ کو شکست دے کر وہ قندھار پر قابض ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد اُس نے کابل پر بھی حکومت کی' مگر ۱۵۰۴ء میں کابل بابر کے قبضے میں چلا گیا۔ ۱۵۱۰ء میں ایران کی صفوی سلطنت کے بانی اسماعیل اوّل نے خراسان پر حملہ کیا۔ مرو کے قریب شیبانی خان مارا گیا اور ہرات تک کا علاقہ اسماعیل صفوی کے قبضے میں چلا گیا۔ بابر نے اس کے ساتھ اتحاد کیا' جس پر ازبکوں نے بابر کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس دوران میں افغان قبائل نے بھی کروٹ لی اور متعدد مقامات پر انہوں نے سر اٹھایا' جسے بابر نے سختی کے ساتھ کچل دیا۔

اگلے کئی برس تک کابل ازبکوں' مغلوں' صفویوں اور افغانوں کی باہمی آویزشوں کا مرکز بنا رہا۔ شمالی علاقے پر مغلوں اور جنوبی خراسان پر صفویوں کا قبضہ تھا۔ ازبکوں نے ہرات پر قبضہ جما لیا تھا۔ فرید خان غوری (شیر شاہ سوری) کے زیر قیادت افغانوں نے کچھ عرصے کے لئے ہندوستان کا تخت چھین لیا۔ اس وقت مغل شہزادہ کامران بدخشاں سے قندھار اور کابل سے سندھ تک کے علاقے پر حکمران تھا۔ ۱۵۴۵ء میں ہمایوں نے قندھار فتح کر لیا اور اگلے ہی برس کابل بھی اس کی دسترس میں آ گیا۔ یہیں سے ہمایوں نے ہندوستان کو دوبارہ فتح کیا۔

اکبر کے عہد میں کابل پر شہزادہ محمد حکیم حکمران تھا۔ ۱۵۷۱ء میں اکبر کابل آیا تو اس کے بعد سے کابل کا علاقہ اکبر کی مغلیہ سلطنت کا مستقل حصہ بن گیا۔ ۱۶۲۱ء میں شاہ عباس صفوی نے قندھار فتح کر لیا۔ اکبری عہد کے آخری دَور میں پشین (بلوچستان) کے ایک رئیس حسن خان ترین کے بیٹے شیر خان ترین نے صفوی اور مغل حکومتوں کے درمیان ایک پائیدار حکومت قائم کر لی۔

۱۶۳۷ء میں شاہجہاں نے قندھار پر چڑھائی کے لئے لشکر بھیجا اور علی مردان خان نے شہر

شاہجہاں کے حوالے کر دیا۔ ۱۶۳۹ء میں شاہجہاں نے کابل کا سفر کیا' جہاں یوسف زئیوں نے شورش برپا کر رکھی تھی۔ اسے فرو کرنے کے بعد ہندوکش سے قندھار تک کا علاقہ سلطنت دہلی کے ساتھ ملحق کر دیا گیا۔ ۱۶۴۶ء میں شاہجہاں نے افغانستان کے شمالی علاقوں پر بھی حملہ کیا اور بدخشاں سے بلخ تک کی سرزمین زیر کر کے اپنی سرحد دریائے آمو تک پہنچا دی۔ ۱۶۴۸ء میں ایران کے جواں سال بادشاہ عباس ثانی نے' جو اُس وقت سولہ سال کا تھا' قندھار پر لشکر کشی کر کے اسے فتح کر لیا۔ بعدازاں یہ شہر پھر کبھی سلطنت مغلیہ کا جزو نہیں بنا۔

۱۶۵۸ء میں اورنگ زیب عالمگیر تخت نشین ہوا۔ اس کا عہد افغانستان کی تاریخ کا سب سے زیادہ پُرشورش زمانہ ہے۔ ۱۶۶۷ء میں اورنگ زیب کو یوسف زئیوں کی سرکوبی کرنا پڑی' جنہوں نے پشاور کے شمال میں ملا چلاک اور سلطان محمود جدون وغیرہ کے زیر قیادت پکھی پر حملہ کیا تھا۔ ۱۶۶۸ء میں ایمل خان مہمند نے مشہور جنگجو شاعر خوشحال خان خٹک کی معیت میں خیبر سے نبرد آزمائی کا آغاز کر دیا۔ ۱۷۰۷ء میں عالمگیر نے وفات پائی اور شہزادہ معظم نے کابل سے آ کر علمِ شاہی نصب کر دیا۔ دہلی کی تیموری حکومت کے آخری دَور میں کابل و پشاور کی حکمرانی ناصر خان کے سپرد تھی اور غزنہ کی باقر خان کے۔ قندھار پر ہوتکی بادشاہوں کا قبضہ تھا' جن کی حکومت پشین' مستونگ اور ڈیرہ جات تک تھی۔ بالآخر ۱۷۳۹ء میں نادرشاہ افشار کے ہاتھوں آلِ تیمور کی دوسو چالیس سالہ حکومت افغانستان سے اٹھ گئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ اڑھائی صدیاں افغانوں سے جنگ اور باہمی خون ریزی میں ضائع ہوئیں اور ہندوستان کی مغلیہ تہذیب کا اثر افغانستان پر کچھ زیادہ نہیں ہوا۔

اُس دَور میں افغانستان پر تین عظیم حکومتوں' یعنی مغلوں (کابل' غزنہ' قندھار)' صفویوں (ہرات وقندھار) اور تورانیوں (بلخ و بدخشاں) کی سرحدیں ملتی تھیں۔ اس سہ طرفہ دباؤ سے پشتونوں میں دفاع اور داخلی خودمختاری کا جذبہ تیز ہو گیا۔ پشتو ادب میں پختگی پیدا ہوئی اور یہ زبان اپنے شباب کو پہنچی۔

افغانستان میں مغلیہ عہد کے چند آثار قابل ذکر ہیں: (۱) چار باغ' قندھار (۲) کابل میں باغ شہرآراء' چار باغ' باغِ جلوخانہ' اور تہ باغ۔ ان میں سے طاقِ چہل زینہ شہزادگان کامران' ہندال اور عسکری نے تعمیر کرایا تھا اور باغات بابر نے۔ (۳) چہار چھتہ' کابل' علی مردان خان (۴) مسجد شور بازار' عالمگیر (۵) باغ صفا' جلال آباد' بابر بادشاہ (۶) قلعۂ شہباز' اکبر (۷) باغ استالف' مسجد سنگِ مرمر' مزارِ بابر' شاہجہاں (۸) بالا حصار' جہانگیر۔ کابل' قندھار' بلخ اور بدخشاں میں ٹکسالیں بھی تھیں جہاں طلائی' نقرئی اور مسی سکے ڈھالے جاتے تھے۔

اس زمانے میں اسلامی حکومتوں کی حدود خلیج بنگال سے جبل الطارق تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ایشیا' افریقہ اور یورپ میں وسیع ممالک اُن کے تحت آ چکے تھے۔ بڑی بڑی غیر مسلم یورپی طاقتوں' مثلاً انگلستان' روس' ہالینڈ' فرانس اور ہسپانیہ سے ہندوستان' ایران اور خلافت عثمانیہ کے سیاسی اور تجارتی

تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ ہندوستان کی تجارت بیرونی ممالک سے خشکی کے راستے یا تو پشاور' کابل اور بخارا کی راہ سے ہوتی تھی یا قندھار اور مشہد کی راہ سے۔ صنعت' تجارت اور علوم وفنون کو اُن عظیم شہنشاہیوں نے بڑی ترقی دی۔ مال و دولت سے لدے ہوئے قافلے برابر کابل' قندھار اور ہرات سے گزرتے رہتے تھے۔ افغانوں کے قبائل تعداد اور رسوخ کے لحاظ سے مستقل ترقی کرتے رہے اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں ابدالی اور غلزئی پہاڑوں سے نکل کر قندھار' زمین داور' ترنگ اور ارغنداب کی زیادہ زرخیز وادیوں میں پھیلے۔

نادر شاہ افشار

۱۷۲۳ء میں شاہ محمود نے اصفہان فتح کرنے کے بعد اپنے چھوٹے بھائی شاہ حسین کو قندھار کا حاکم بنا دیا تھا۔ اس کے عہد میں حدودِ سلطنت فراہ' ہرات' سبزوار' غزنہ اور گومل سے آگے پشین اور ڈیرہ جات تک پھیل گئیں' حتیٰ کہ اس کی فوجیں ملتان کی حدود میں بھی داخل ہو گئیں۔ اس کی حکومت ۱۷۳۶ء تک رہی اور اسی سال نادر شاہ افغانستان کو فتح کرنے کے لئے ہرات میں ابدالیوں کا تختہ الٹانے کے بعد قندھار کے درپے ہوا۔ شاہ حسین نے تقریباً ایک سال تک ڈٹ کر مقابلہ کیا' لیکن بالآخر اسے ۱۷۳۷ء میں قندھار نادر شاہ کے حوالے کرنا پڑا' جس نے شہر کو تاراج کیا اور ۱۷۳۸ء میں شاہ حسین کو زہر دے کر مروا ڈالا۔

نادر شاہ نے ایران میں ہوتکیوں' ہرات میں ابدالیوں اور قندھار میں غلزئیوں کی بساط حکومت الٹ دی' لیکن اس کے بعد اس نے افغان قبائل کے بارے میں بالعموم اور ابدالیوں کے ساتھ بالخصوص مصالحت کی حکمت عملی اختیار کی اور ان کی بڑی بڑی جمعیتیں اپنی فوج میں بھرتی کر لیں۔ ابدالی پٹھانوں کے ایک دستے کا سردار احمد خان تھا۔ احمد خان نے نادر شاہ کی لڑائیوں میں بڑی نمایاں خدمات انجام دیں۔ وہ دہلی کی فتح کے موقع پر بھی موجود تھا۔ اس کا شمار نادر شاہ کے وفادار ساتھیوں میں ہوتا تھا۔ جون ۱۷۴۷ء میں جب کوچان (خراسان) کے مقام پر نادر شاہ کو اس کے شیعہ سرداروں نے قتل کر دیا تو احمد خان فرار ہو کر قندھار آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ نادر شاہ کے خزانے کا ایک بڑا حصہ بھی لے آیا' جس میں مشہور ہیرا کوہِ نور بھی شامل تھا' جسے نادر شاہ دہلی سے لے گیا تھا۔ قندھار میں ۱۷۴۷ء میں افغانوں نے احمد خان کو سردار منتخب کر لیا اور وہ ''احمد شاہ'' کے نام سے اکتوبر ۱۷۴۷ء میں تخت نشین ہوا۔

احمد شاہ ابدالی

احمد شاہ نے اپنا لقب ''دُرِ دوراں'' اختیار کیا' جس کی نسبت سے اس کو احمد شاہ دُرّانی بھی کہا جاتا ہے۔ احمد شاہ نے برعظیم پاک و ہند پر ۱۷۴۷ء اور ۱۷۶۹ء کے درمیانی عرصے میں نو مرتبہ حملے کئے اور سرہند تک کا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ۱۷۵۲ء میں کشمیر پر بھی قبضہ کر لیا۔ وہ دو مرتبہ

دہلی آیا۔ ۱۴ر جنوری ۱۷۶۱ء کو ہندوستان کے مسلمان امراء کے ساتھ مل کر پانی پت کے میدان میں اس نے مرہٹوں کو شکست دی۔ احمد شاہ ابدالی کے زمانے میں پنجاب میں مرہٹوں کے بعد سکھوں کا زور بہت بڑھ گیا تھا اور اسے سکھوں کی سرکوبی کے لئے بار بار پنجاب آنا پڑتا تھا۔ احمد شاہ جب آتا تھا تو سکھ سردار فرار ہو جاتے تھے اور پہاڑوں میں پناہ لے لیتے تھے' لیکن جب وہ واپس چلا جاتا تھا تو پھر قتل و غارت میں مصروف ہو جاتے تھے۔ بالآخر اس کے جانشینوں کے عہد میں پنجاب ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ قلات کے خان بروہی میر نصیر خان نے بھی' جو نادر شاہ کا باج گزار تھا' ۱۷۵۸ء میں خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا' لیکن بعد میں احمد شاہ کی بالادستی تسلیم کر لی۔ احمد شاہ کا جب انتقال (۱۷ر اکتوبر ۱۷۷۲ء) ہوا تو وہ تمام علاقہ جو آج افغانستان کہلاتا ہے' اس کے قبضے میں تھا۔ کشمیر' صوبہ سرحد اور ملتان بھی اس کی سلطنت میں شامل تھے۔ سندھ' بلوچستان اور خراسان اس کی بالادستی تسلیم کرتے تھے۔

احمد شاہ ابدالی ایک عالم' پشتو کا صاحب دیوان شاعر' دین دار اور بہادر شخص تھا۔ رعایا کے ساتھ مہربانی اور عدل سے پیش آتا اور اپنی مملکت سے باہر کے مسلمانوں کے ساتھ اخوت اسلامی کا سلوک کرتا تھا۔ اس نے افغانستان کی اتنی شاندار خدمات انجام دیں کہ وہاں کے لوگ اسے ''بابا'' کے لقب سے یاد کرنے لگے۔ افغانستان میں ملکی' فوجی' مالی اور مدنی محکمے قائم کر کے وزیر مقرر کئے۔ قندھار کا موجودہ شہر اور بعض دوسرے شہر آباد کئے۔ ۱۷۵۲ء میں کابل کا جنگی قلعہ تعمیر کرایا۔ اس کی افواج ایک لاکھ نفوس پر مشتمل تھیں اور سالانہ آمدنی تین کروڑ دس لاکھ روپے تھی۔

احمد شاہ اپنے اخلاق و کردار' فوجی صلاحیت' عدل و انصاف اور دین داری کی وجہ سے تاریخ اسلام کے ممتاز حکمرانوں میں شمار ہوتا ہے' لیکن اس میں کچھ خامیاں بھی تھیں۔ اس نے پانی پت کی جنگ میں مرہٹوں کو زبردست شکست دی' لیکن دہلی میں ایک مضبوط حکومت قائم کرنے کی بجائے واپس قندھار چلا گیا۔ پنجاب میں وہ سکھوں کو قابو میں نہیں رکھ سکا۔ لاہور اور دہلی میں اس کی فوجوں نے جس طرح قتل عام کیا' وہ ایک مسلمان حکمران کے شایانِ شان نہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا اپنی فوج پر پوری طرح کنٹرول نہیں تھا۔

احمد شاہ ابدالی کے جانشین

احمد شاہ کے بعد اس کا بیٹا تیمور شاہ (۱۷۷۳ء۔۱۷۹۳ء) تخت نشین ہوا۔ اس کے دور میں سندھ اور بلوچستان پر سے افغانوں کی بالادستی ختم ہو گئی اور وہ آزاد ہو گئے۔ مرو پر امیر بخارا نے قبضہ کر لیا اور خراسان میں مشہد اور نیشاپور بھی ہاتھ سے نکل گئے۔ لیکن باقی سلطنت میں تیمور شاہ نے امن قائم رکھا۔ اس نے دارالحکومت قندھار سے کابل منتقل کر دیا اور اس وقت سے کابل افغانستان کا مستقل دارالحکومت بن گیا۔

تیمور شاہ کے بعد اس کا بیٹا زمان شاہ (۱۷۹۳ء۔۱۸۰۱ء) تخت نشین ہوا' لیکن اس کا عہد خانہ جنگیوں میں گزر گیا۔ ۱۷۶۵ء کے بعد سے لاہور پر سکھ قابض ہو گئے تھے۔ زمان شاہ نے پنجاب پر پھر قبضہ کرنے کی کوشش کی اور ۱۷۹۸ء میں وہ لاہور پر قابض ہو گیا۔ سکھ سبِ دستور فرار ہو گئے' لیکن جب زمان شاہ واپس چلا گیا تو انہوں نے لاہور پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ ۱۷۹۹ء میں زمان شاہ نے ایک سکھ سردار رنجیت سنگھ کو لاہور کا صوبے دار مقرر کیا' لیکن یہ صرف ایک ضابطے کی کارروائی تھی' ورنہ پنجاب مستقل طور پر افغانستان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور اب وہاں ایک آزاد سکھ حکومت قائم ہو چکی تھی۔

۱۸۰۱ء میں زمان شاہ کو اس کے بھائی محمود شاہ نے اندھا کر کے قید کر دیا۔ اب افغانستان پوری طرح خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ گیا۔ ۱۸۰۳ء میں انگریزوں سے دوستی کا عہد نامہ کیا تو اس کے خلاف بغاوت ہو گئی اور ۱۸۱۰ء میں محمود شاہ دوبارہ تخت پر قابض ہو گیا' لیکن اس نے اپنے غلط طرزِ عمل سے بارک زئی قبیلے کو اپنا مخالف بنا لیا اور ایک بارک زئی سردار دوست محمد خان نے ۱۸۲۶ء میں کابل پر قبضہ کر کے دُرّانی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

امیر دوست محمد خان

دوست محمد خان کے کابل پر قابض ہو جانے کے بعد شاہ شجاع نے رنجیت سنگھ اور انگریزوں سے مدد لے کر کابل پر قبضہ کرنا چاہا۔ رنجیت سنگھ کی مدد سے وہ کابل پر تو قبضہ حاصل نہ کر سکا' لیکن ''کوہِ نور'' کا قیمتی ہیرا کھو بیٹھا' جسے رنجیت سنگھ نے چالاکی سے حاصل کر لیا۔ البتہ انگریزوں نے شاہ شجاع کی مدد کی۔ انگریزی فوجیں ۱۸۳۹ء میں امیرانِ سندھ کے علاقے سے زبردستی گھس کر' کوئٹہ کے راستے افغانستان میں داخل ہوئیں اور شاہ شجاع کو کابل کے تخت پر بٹھا دیا۔ دوست محمد خان بھاگ کر بخارا چلا گیا۔ شاہ شجاع انگریزوں کی مدد سے زیادہ عرصہ تخت پر قابض نہیں رہ سکا۔ ۱۸۴۲ء میں اس کے خلاف بغاوت ہو گئی۔ انگریزی دستے کے چار پانچ ہزار سپاہی قتل کر دیئے گئے۔ اس ہنگامے میں شاہ شجاع بھی ہلاک ہو گیا۔ ستمبر کے مہینے میں انگریزوں نے جوابی کارروائی کی اور کابل کو جلا کر برباد کر دیا۔ انگریزوں کی واپسی کے بعد دوست محمد خان جنوری ۱۸۴۳ء میں پھر کابل پر قابض ہو گیا۔ افغانستان کے ان ہنگاموں سے پنجاب کے سکھوں نے فائدہ اٹھایا۔ ۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ نے کشمیر پر اور ۱۸۲۳ء میں پشاور پر بھی قبضہ کر لیا۔

بارک زئی خاندان (۱۸۲۶ء۔۱۸۳۹ء)

امیر دوست محمد خان بارک زئی خاندان کی حکومت کا بانی ہے۔ اس نے افغانستان پر پہلی مرتبہ ۱۸۲۶ء سے ۱۸۳۹ء تک حکومت کی اور اس کے بعد ۱۸۴۳ء سے ۱۸۶۳ء تک حکومت کی۔ اس کے عہدِ حکومت میں پشاور پر سکھوں کا قبضہ ہوا' اسی کے عہد میں سید احمد شہید نے پشاور اور ملحقہ علاقے میں اسلامی جمہوری حکومت قائم کر کے پاکستان کے موجودہ صوبہ سرحد کو سکھوں کے تسلط سے آزاد کرانے

کی کوشش کی تھی۔ دوست محمد خان کے عہد ہی میں پہلی مرتبہ افغانوں کا انگریزوں سے تصادم ہوا' جنہوں نے شاہ شجاع کو کابل کے تخت پر بٹھا کر افغانستان میں اپنی کٹھ پتلی حکومت قائم کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔

دوست محمد خان کے بعد اس کا لڑکا امیر شیر علی (۱۸۶۳ء۔۱۸۷۹ء) تخت نشین ہوا۔ انگریزوں نے اس کے دور میں پھر اپنا اثر بڑھانے کی کوشش کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب روس ترکستان پر قابض ہو گیا تھا اور سلطنت روس کی سرحدیں افغانستان سے مل گئی تھیں۔ روس کے خطرے کے پیش نظر برطانیہ چاہتا تھا کہ افغانستان پر اس کا اثر قائم رہے' لیکن جب امیر شیر علی انگریزوں کے آگے نہیں جھکا اور روس سے تعلقات قائم کرنا چاہے تو انگریزوں نے افغانستان کے معاملے میں پھر مداخلت کی۔ اس وقت تک سندھ' پنجاب اور سرحد انگریزوں کے قبضے میں آ چکے تھے اور ۱۸۷۶ء میں انہوں نے کوئٹہ اور بلوچستان پر بھی اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا۔ اس کے بعد انگریزوں نے ۱۸۷۸ء میں کابل پر بھی قبضہ کر لیا۔ امیر شیر علی فرار ہو کر ترکستان چلا گیا اور اس کے بیٹے یعقوب خان نے ۱۶ر مئی ۱۸۷۹ء کو انگریزوں سے ایک معاہدہ کر لیا جو ''معاہدۂ گنڈامک'' کہلاتا ہے۔ اس معاہدے کے تحت آخر کار انگریز افغانستان پر اثر قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب افغانستان انگریزوں کی مرضی کے بغیر کسی دوسرے ملک سے تعلقات قائم نہیں کر سکتا تھا۔ امیر یعقوب خان نے ایک مختصر انگریزی فوج بھی کابل میں رکھنے کی اجازت دے دی' لیکن افغان حریت پسندوں نے انگریزی دستے پر حملہ کر کے اسے ختم کر دیا۔ یہ واقعہ افغانستان اور انگریزوں کے درمیان دوسری جنگ کا باعث ہوا جو ۱۸۷۹ء اور ۱۸۸۰ء میں برابر جاری رہا۔ اس جنگ کے دوران میں انگریزوں نے کابل پر قبضہ کر لیا۔ اب انگریزوں نے ایک ایسے شخص کو کابل کے تخت پر بٹھانا چاہا جو افغانستان کے باشندوں کو بھی قابو میں رکھ سکے اور انگریزوں کا بھی دوست ہو۔ چنانچہ انہوں نے ۲۲ جولائی ۱۸۸۰ء کو دوست محمد خان کے پوتے عبدالرحمٰن خان کو امیر افغانستان بنا دیا اور اپنی فوجیں کابل سے واپس بلا لیں۔

امیر عبدالرحمٰن خان (۱۸۸۰ء۔۱۹۰۱ء)

جب امیر عبدالرحمٰن تخت نشین ہوئے تو سارے افغانستان میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی' اور ملک میں تخت کے اور دعوے دار بھی موجود تھے' لیکن امیر عبدالرحمٰن نے جلد ہی تمام مخالف قوتوں کو کچل کر امن و امان قائم کر دیا۔ اگر احمد شاہ ابدالی افغانستان کے پہلے بادشاہ تھے تو امیر عبدالرحمٰن خان بجا طور پر جدید افغانستان کے بانی تھے۔ آج کے افغانستان کی حدود انہی کے زمانے میں قائم ہوئیں۔ ۱۸۸۷ء میں شمال میں ترکستان کے ساتھ حد بندی کی گئی۔ ۱۸۸۸ء میں ایران اور افغانستان کے درمیان حد بندی کی گئی اور ۱۸۹۳ء میں انگریزوں سے ایک معاہدے کے تحت برطانوی ہند کے ساتھ حد بندی کی گئی۔ یہ نئی سرحد برطانوی ہند کے سیکریٹری خارجہ سر مورٹی مرڈیورنڈ کے نام پر ''ڈیورنڈ

لائن'' کہلاتی ہے' اور اب پاکستان اور افغانستان کے درمیان بین الاقوامی سرحد کی حیثیت رکھتی ہے۔

امیر حبیب اللہ خان (۱۹۰۱ء۔۱۹۱۹ء)

امیر عبدالرحمٰن کے بعد ان کے لڑکے امیر حبیب اللہ خان تخت نشین ہوئے۔ ان کے دَور میں پہلی مرتبہ افغانستان میں بجلی گھر اور کارخانے قائم ہوئے اور پختہ سڑکیں بنائی گئیں۔ افغانستان کا پہلا جدید طرز کا مدرسہ حبیبیہ کالج اُسی دَور میں قائم ہوا۔ حبیب اللہ خان کے دَور میں جدید نظریات وافکار افغانستان میں داخل ہوئے اور ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جو ترکی اور ایران کی طرز پر افغانستان میں اصلاحات چاہتا تھا اور افغانستان کو برطانوی اثر سے نکالنا چاہتا تھا۔ اس دوران میں جنگ عظیم چھڑ گئی اور افغانستان میں ترکوں کی حمایت کرنے کی تحریک زور پکڑ گئی۔ امیر حبیب اللہ بعض مصلحتوں کے تحت افغانستان کو غیر جانب دار رکھنا چاہتے تھے اور برطانوی ہند سے ٹکراؤ نہیں چاہتے تھے۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ امیر حبیب اللہ خان قتل کر دیئے گئے۔

امیر امان اللہ خان (۱۹۱۹ء۔۱۹۲۹ء)

امیر حبیب اللہ خان کے قتل کے بعد اُن کے لڑکے امان اللہ خان تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے انگریزوں سے لڑائی شروع کر دی۔ ہندوستان میں اس زمانے میں آزادی کی تحریک پوری قوت سے جاری تھی' اس لئے انگریزوں نے افغانستان سے صلح کرنا بہتر سمجھا۔ ''معاہدۂ گنداک'' کے وقت سے افغانستان کی خارجہ پالیسی انگریزوں کے ہاتھ میں چلی گئی تھی' اس لئے امیر امان اللہ خان بھی صرف یہ چاہتے تھے کہ افغانستان کی خارجہ پالیسی کو انگریزوں کے اثر سے آزاد کر لیں اور افغانستان کو صحیح معنوں میں ایک آزاد اور خود مختار ملک بنا دیں۔ چنانچہ ۸/اگست ۱۹۱۹ء کو راولپنڈی میں حکومت برطانیہ اور افغانستان کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا اور انگریزوں نے افغانستان کی مکمل خود مختاری تسلیم کر لی۔ یہ امان اللہ خان کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔

امان اللہ خان نے سفیروں کے ذریعے ساری دنیا سے روابط قائم کر لئے اور مملکت جدید ترقیات کی طرف قدم بڑھانے لگی۔ ۱۹۲۱ء میں روس کی سوویت حکومت اور برطانیہ سے نئے معاہدے کئے گئے' اگرچہ کشیدگی شمالی سرحدوں پر ۱۹۲۲ء تک اور جنوبی ومشرقی سرحدوں پر ۱۹۲۴ء تک جاری رہی۔ ۱۹۲۲ء میں لوئی جرگے نے ایک دستورِ اساسی مرتب و نافذ کیا۔ ۱۹۲۳ء میں انتظامی دستور العمل مرتب ہوا۔ افواج کی تنظیم واصلاح جدید ترین اصول پر ہوئی اور دنیا بھر کے ممالک سے تجارتی تعلقات کا قیام عمل میں آیا۔ داخلی اصلاحات کا اجراء ہوا' مثلاً غلامی کی تنسیخ' پرنٹنگ پریس کا قیام' اخبارات کا اجراء' بلدیات کا قیام' سڑکوں اور پلوں کی تعمیر' ٹیلی گراف اور ٹیلی فون کی توسیع' کانوں کی کھدائی' کابل میں مجلس شوریٰ اور صوبوں میں مجالسِ مشورہ کا قیام' سیاسی پارٹیوں کی آزادی' جہالت

اور تعصب کے خلاف جدوجہد' اعلیٰ تعلیم کا انتظام' حمل ونقل کے جدید وسائل کی درآمد اور ان کا اجراء۔ ۱۹۲۴ء میں خواتین کے لئے بھی اعلیٰ تعلیم کی تدابیر اختیار کی گئیں' جس پر انگریزوں کے اشارے سے ایک مفرور افغانی سردار عبدالکریم کے زیر سرکردگی خوست میں بغاوت ہوگئی۔ کابل کے فوجیوں نے باغیوں کو گرفتار کر کے گولی سے اڑا دیا اور عبدالکریم ہندوستان کی طرف بھاگ آیا۔ یہ پہلی رجعت پسندانہ تحریک تھی جو انگریزوں کی انگیخت پر امان اللہ خان کے خلاف پیدا ہوئی۔

۱۹۲۴ء میں دوسرے لوئی جرگے نے تعلیم نسواں سے متعلق قوانین منسوخ کر دیئے۔ نیز جبری بھرتی کے قوانین میں ترمیم کر دی۔ جب امن قائم ہوگیا تو امان اللہ خان نے ۱۹۲۶ء میں ''بادشاہ'' کا لقب اختیار کیا اور ۱۹۲۸ء میں یورپی ملکوں کی سیاحت کی۔ ان سے سیاسی' علمی' ثقافتی اور اقتصادی معاہدات طے کئے اور کاغذ سازی' شکر سازی' قالین بافی اور ٹیکسٹائل کے کارخانے خرید کر ملک میں لایا۔ یورپ کے اُس دورے سے واپس آ کر بادشاہ نے نئے دستور اساسی کے نفاذ اور معاشرتی و تعلیمی اصلاحات کی ترتیب کے لئے تیسرا لوئی جرگہ طلب کیا۔ چونکہ امان اللہ خان کا ماسکو جانا حکومت برطانیہ کے سیاسی مقاصد کے موافق نہ تھا اور اسے ہندوستان کے لئے خطرے کی علامت سمجھا گیا' اس لئے انگریزی حکومت نے ہندوستان کے سرحدی قبائل میں شورش برپا کر دی۔ اس کے علاوہ حکومت برطانیہ کی شہ پر ایک تاجک ڈاکو بچہ سقا نے کوہ دامن سے پیش قدمی کر کے کابل پر قبضہ کر لیا (جنوری ۱۹۲۹ء)۔ امان اللہ خان قندھار کی طرف نکل گیا۔ وہاں سے اس نے کابل دوبارہ حاصل کرنے کے لئے جو کوشش کی' اسے بچہ سقا کے حامیوں نے ناکام بنا دیا۔ دریں اثنا ہرات پر ایک اور تاجک عبدالرحیم کا قبضہ ہوگیا۔ امان اللہ خان چمن کے راستے افغانستان سے رخصت ہوگیا اور اٹلی جا کر سکونت اختیار کر لی' جہاں ۱۹۵۱ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔

محمد نادر خان (۱۹۲۹ء۔۱۹۳۳ء)

ملک میں ابتری پیدا ہوگئی تو سپہ سالار محمد نادر خان فرانس میں بیمار پڑا تھا۔ جنگِ استقلال میں کامیابی کا سہرا اسی کے سر رہا تھا' لیکن وہ ملکی پالیسی سے شدید اختلافات کی بنا پر' نیز علاج کے لئے ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ انتہائی کمزوری کی حالت میں واپس آیا۔ قوم کو امن واتحاد کی دعوت دی اور اعلان کیا کہ حکومت کا آخری فیصلہ قومی نمائندوں پر چھوڑا جائے۔ بچہ سقا سے بھی یہی کہا کہ اپنا معاملہ قوم کے حوالے کر دے۔ کئی مہینے کی ناکامیوں اور پریشانیوں کے بعد سپہ سالار نے وزیریوں اور محسودوں کا ایک لشکر فراہم کیا' جس نے سپہ سالار کے بھائیوں شاہ ولی خان اور شاہ محمود خان کی سرکردگی میں کابل پر قبضہ کر لیا' جہاں قومی نمائندوں نے ۱۲/اکتوبر ۱۹۲۹ء کو محمد نادر خان کی بادشاہی کا اعلان کر دیا' اور اب وہ نادر خان سے زیادہ نادر شاہ کہلانے لگا۔

بچہ سقا نے ہتھیار ڈال دیئے اور اسے موت کی سزا دی گئی۔ ملک میں امن وامان قائم کرنے میں

مزید دو سال لگے۔ امان اللہ خان کے حامیوں میں اضطراب اور بے چینی کی آگ سلگتی رہی' جن میں سب سے زیادہ سرگرم لوگر کا چرخی خاندان تھا۔ اس خاندان کے ایک سرکردہ رکن کو سزائے موت دینے کے باعث ایک خونیں عداوت کی صورت پیدا ہو گئی۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں قبائلیوں کی شورشیں ہوئیں' جن کو سختی سے دبا دیا گیا۔ نادر شاہ نے وہ مکتب اور مدرسے از سر نو کھولے جو بچہ سقا کی شورش اور بدامنی کے دوران بند ہو گئے تھے۔ ان کے علاوہ ''دار الفنون'' کے نام سے ایک درس گاہ جاری کی۔ اس نے عساکر کو منظم کیا۔ ہر شعبے میں اصلاحات نافذ کیں۔ طلبہ میں تعلیم کا شوق بڑھانے اور قوم کو تعلیم کی اہمیت پر متوجہ کرنے کے لئے نادر شاہ خود سندیں اور انعامات تقسیم کیا کرتا تھا۔ ایسی ہی ایک تقریب پر' جو ''قصر دلکشا'' میں منعقد ہوئی تھی' عبدالخالق نام کے ایک طالب علم نے' جو چرخی خاندان کا پروردہ تھا' اس وقت نادر شاہ کو گولی ماردی جب وہ طلبہ کی پہلی قطار کے ایک ایک فرد سے مصافحہ کر رہا تھا (۸ر نومبر ۱۹۳۳ء)۔ نادر شاہ کے بھائیوں نے اس کے انیس سالہ بیٹے ظاہر شاہ کو تخت پر بٹھا دیا۔

۱۹۳۴ء: افغانستان انجمن اقوام (لیگ آف نیشنز) کا رکن بنا۔ اگلے دو تین برس تک روس' ترکی' عراق اور ایران کے ساتھ سیاسی اور تجارتی معاہدے ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم میں بھی افغانستان غیر جانب دار رہا۔

۱۹۴۷ء: روس اور ایران کے ساتھ سرحدی تنازعات طے کئے گئے۔ پاکستان قائم ہونے کے بعد افغانستان نے بھارت' برطانیہ اور روس کی شہ پر نام نہاد مسئلہ پختونستان کا آغاز کر دیا' جبکہ صوبہ سرحد ریفرنڈم کے تحت پاکستان میں شامل ہوا تھا۔ ۱۹۶۲ء میں اس مسئلے کی بنا پر کچھ عرصے کے لئے پاکستان اور افغانستان کے سفارتی تعلقات بھی منقطع ہو گئے۔ اس وقت افغانستان کا وزیر اعظم سردار داؤد خان تھا جو پاکستان کا سب سے بڑا مخالف اور پختونستان کے مسئلے کا شدت سے حامی تھا۔ (مگر اس کی سبکدوشی کے بعد تعلقات معمول پر آ گئے)

۱۹۵۳ء: لیفٹیننٹ جنرل داؤد خان وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ انہوں نے اقتصادی اور معاشرتی اصلاحات کے اپنے منصوبے پر عمل درآمد کیا۔

۱۹۶۳ء: داؤد خان کو مستعفی ہونے پر مجبور کیا گیا۔ آئینی بادشاہت قائم ہوئی۔

۱۹۷۳ء: داؤد خان نے فوجی بغاوت کر کے آئینی بادشاہت کا خاتمہ کیا۔

۱۹۷۸ء: ایک اور فوجی بغاوت میں داؤد خان قتل ہوئے۔ محمد ترہ کئی اور کمیونسٹ پارٹی نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

اس کے بعد افغانستان کے سیاسی حالات نے زبردست ہیجان اور طوفان کی سی صورت اختیار کر لی' جو آج تک نہیں تھما۔ اس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ''آئندہ شمارہ''۔